ماہنامہ

# حیاتِ نو

"سنتے ہیں کسی زمانے میں آپ لوگ ایسے ہی تھے، آپ کی دوستی اور دشمنی، آپ کی جنگ و صلح صرف کلمۃ اللہ کی بلندی کے لیے صرف خدمت کے لیے ہوتی تھی، آپ فلسفہ پڑھتے تھے تو اسی لئے کہ مسلمان فلسفی اور متکلم بن کر نکلیں اور سائنس سیکھتے تھے تو اسی لئے کہ مسلم سائنٹسٹ کی حیثیت سے چمکیں آپ کی ایک دھن تھی اور ایک لگن اور ایک تڑپ تھی اشاعت توحید کی، اقامت شریعت کی ـــ کیا اب ناممکن ہے کہ ہم از سرِ نو ایمان لائیں اور جو کچھ بھی کریں، جو کچھ بھی پڑھیں، جو کچھ بھی سیکھیں، سب کلمۂ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی تشریح کے لئے، توضیح کے لئے وقف ہو؟"

(مولانا عبدالماجدؒ ـــ صدق ۲۸ جولائی ۱۹۵۴ء)

---

ماہنامہ حیاتِ نو جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڈھ (یو۔پی)

## مفکرِ اسلام مولانا مودودیؒ

### اپنے رب سے جا ملے ——— لیکن .....

آپ کے افکار، آپ کے پیش کردہ اصول اور آپ کی مردم ساز تحریریں تابندہ ہیں۔

ماہنامہ "حیاتِ نو" کا "مجدد مودودی نمبر" ایک قیمتی دستاویز ہے

### جس میں

- آنسوؤں سے استقبال، آنسوؤں سے خدا حافظ۔
- اس صدی کا رجل عظیم اٹھ گیا۔
- نوجوان فرطِ غم سے بیہوش ہوگئے (سفرِ آخرت کا آنکھوں دیکھا حال)
- درسِ قرآن، پُر مغز اداریہ اور
- شعراء کا نذرانۂ عقیدت

### سبھی کچھ موجود ہے

قیمت صرف پانچ روپئے (5/-) ہے، لیکن سالانہ خریداروں کو ان کی خریدی ہی میں دیا جائے گا۔

اس خصوصی رعایت سے فائدہ اٹھا کر سالانہ خریداروں میں اپنا نام شامل کروائیے۔

**ماہنامہ حیاتِ نو، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڈھ یوپی**

ماہنامہ

# حیاتِ نو

جلد ۲ شمارہ ۱۲

محرم ۱۴۰۰ھ ، دسمبر ۱۹۷۹ء


## مجلسِ ادارت


| | |
|---|---|
| الفضا احمد فلاحی مدیر مسئول | (بلریاگنج) |
| نسیم احمد غازی فلاحی | (دہلی) |
| رضوان احمد فلاحی | (مدینہ منورہ) |
| جاوید اشرف فلاحی | (جامعۃ الفلاح) |
| عبید اللہ محمد | (جامعۃ الفلاح) |



قیمت فی شمارہ:- ۵۰/۱

سالانہ زرتعاون:- پندرہ روپے ۱۵/-


اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کا سالانہ زرتعاون ختم ہو چکا ہے براہ کرم سالانہ زرتعاون مبلغ -/۱۵ روپے ارسال فرما کر مشکور فرمائیں۔

(منیجر ادارہ)

# آئینہ ترتیب


### ۱- دھڑکنیں

| | | |
|---|---|---|
| موتوا بغیظکم (جلو حسد کی آگ میں) | اداریہ | ۲ |

### ۲- انٹرویو

| | | |
|---|---|---|
| آئے یورپ تازہ دیا جس نے دلوں کو | نامہ نگار الدعوۃ قاہرہ | ۴ |

### ۳- فکر و نظر

| | | |
|---|---|---|
| عورت کا حاکم بننے کا مسئلہ | مولانا عبد الحکیم ایم اے پی ایچ ڈی | ۹ |
| رسم جہیز کے بارے میں ایک مشہور غلط فہمی | پروفیسر رفیع اللہ شہاب | ۳ |

### ۴- ادبی تحفہ

| | | |
|---|---|---|
| بھٹکا ہوا مسافر | طارق احسن فلاحی | ۲۵ |

### ۵- دل کی پکار

| | | |
|---|---|---|
| امیر جماعت اسلامی پاکستان ڈاکٹر نور العین عثمانی، ابو محمد امام الدین رامنگری | | ۳۰ |

### ۶- موج و حباب

| | | |
|---|---|---|
| یہ پانچ لاشیں | شبنم سبحانی | ۳۳ |
| نذرانۂ عقیدت | قمر اصلاحی | ۳۵ |
| جس نے روشن کر دیے ایوانِ ظلمت میں چراغ | راشد حامدی | ۳۲ |
| دو قطعات | نادان بستوی | ۳۴ |

### ۷- جستہ جستہ

| | | |
|---|---|---|
| یہ صرف دیوانوں ہی کا کام ہے | مولانا مودودی | ۴۸ |
| مودودی صاحب کا انتقال | آزاد ہند کلکتہ | ۴۴ |
| اجلاس شوریٰ کی رپورٹ | سکریٹری الحسن | ۴۴ |

دھڑکنیں

# مُوتوا بغیظکم
## (جلو حسد کی آگ میں)

لینن نے اشتراکی پارٹی کے کارکنوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ :- "اگر ضرورت پیش آئے تو مزدور تنظیموں میں اپنا اثر و نفوذ قائم کرنے، ان میں گھسے رہنے اور ہر قیمت پر اشتراکی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لئے ہر قسم کے حربوں سے بلا تکلف کام لو، سازش، جوڑ توڑ، غیر قانونی ذرائع کا استعمال، دھوکہ وغیرہ سب سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤ۔"

(LANIN V.I. HE WING COMMNISM P.38)

اس اشتراکی مفکر نے اپنی ایک تحریر میں ضابطہ اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے :- "ہم ان تمام اخلاق کا استرداد کرتے ہیں جو انسانی طبقاتی تصورات سے باہر ہے، ہم کہتے ہیں کہ یہ ایک دھوکہ ہے جھل ہے، جو جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے مفاد کی تکمیل کیلئے مزدوروں اور کسانوں کے دماغ کو زنگ لگا دیتا ہے، ہم کہتے ہیں کہ ہمارا اخلاق پرولتاری طبقے کی طبقاتی جنگ کے مفاد کے مکمل طور پر تابع ہوتا ہے۔ ہمارا اخلاق پرولتاری طبقاتی جنگ کے مفاد سے ماخوذ ہے۔"

(لینن کی منتخب تحریریں جلد ۱۰ صفحہ ۳۲۷)

آج تو اسلام اور روحانی قدروں کے خلاف سوویٹ بلاک کی یہ جنگ اور زیادہ شدت اختیار کر چکی ہے "ترقی پسندی" اور "جمہوری اصولوں" کے نام پر اخلاق و کردار کی تباہی اور مذہبیت کے استحصال میں اور زیادہ جوش و خروش پیدا ہوتا جا رہا ہے اور یہ سب اس وجہ سے ہو رہا ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام کے روپ میں جلوہ گر ہو رہا ہے، بہت سے ممالک اس کا تجربہ کر رہے ہیں، مغربی دنیا تمام نظریات سے مایوس ہو کر اسلام کی طرف نگاہ لگائے ہوئے ہے، آج اشتراکیت کی حالت اس زخمی شیر کی سی ہے جو زخم کھانے کے بعد اپنا زخم چاٹ رہا، خدشہ ہے کہ اپنے آخری ہتھیار عالم اسلام کے خلاف استعمال نہ کرے۔ چنانچہ [illegible] کی کمیونسٹ پارٹی کے اخبار "[illegible]"

کی ۵ر جولائی ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں ایک اشتراکی ماہر نظریہ اے بی نوموف نے "اسلام کا ایشیائی سوشلسٹ اور ایشیائی سائنٹفک کردار" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ :- "سوشلسٹ نظام بھی قائم ہو سکتا ہے اگر سرمایہ دارانہ جائداد کے سسٹم کو ختم کر دیا جائے اور ذرائع پیداوار پبلک کی ملکیت ہوں، اسلام نجی جائداد کا دفاع کرتا ہے اور اسی بنیادی مسئلے پر سوشلزم سے متصادم ہے لہٰذا سوشلسٹ نظام میں اس کیلئے کوئی جگہ نہیں۔" (ماہنامہ تحریک نئی دہلی اکتوبر ۱۹۸۰ء)

اسلام سے سوویٹ بلاک کی یہی دشمنی ہے جو عالم اسلام میں وہ چاہتے کہ اسلام پر ہر طرح کیچڑ اچھالنے کیلئے اکساتی رہتی ہے، وہ لینن کے اس اصول اور نصیحت پر "کمیونسٹوں کو ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہنا چاہئے اور اگر ضرورت پڑے تو ہر قسم کی چالاکی اور عیاری سے کام لینا چاہئے، انہیں غیر آئینی طریقے اختیار کرنے اور صداقت کی پردہ پوشی اور اس سے پہلو تہی کی تمام چالیں استعمال کرنی چاہئیں"

(لینن از ڈی پیرو شتیب)

یہ پوری طرح کاربند ہے، براہ راست اسلام پر حملہ کرنے کے بجائے اسلامی تحریکوں کو بدنام کرنا اور ان کے خلاف سرد جنگ جاری رکھنا معروف ہے۔ اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا کی دوسری کل ہند کانفرنس منعقدہ ۲۰ و ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۰ء کے سلسلے میں بھی انہوں نے ہر نومبر کے شمارے میں اسی تکنیک کو استعمال کیا ہے، یہ کانفرنس طلبہ و نوجوانوں کو اسلام کے پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے اور ملک کی تعمیر نو اسلام کی بنیادوں پر کرنے کا داعیہ پیدا کرنے میں بہت زیادہ کامیاب رہی، اس نے غیر اسلامی عناصر اور فرقہ پرست تنظیموں اور پارٹیوں کی آنکھیں کھول دیں، نوجوانوں کے اندر ایک نئی امنگ پیدا کی، نیا حوصلہ اور اسلام کیلئے مرمٹنے کی تڑپ اس نے پیدا کی اسلامی تہذیب کی برتری اور اقامت دین کے لئے نوجوانوں کو اس نے آگے بڑھایا لیکن اسلام کے خلاف

پروفیسر فیح اللہ شہاب

# رسم جہیز کے بارے میں ایک مشہور غلط فہمی

رسم جہیز کی لعنت نے آج کتنے ہی خاندانوں کو اجاڑ کر رکھ دیا ہے، یہ مضمون معاصر ماہنامہ "فکر و نظر" پاکستان کے شکریہ کے ساتھ نقل کیا جا رہا ہے، جہیز کے سلسلے میں ہمارے یہاں بھی شرعی علمی بحثیں ہوتی رہتی ہیں، یہ مضمون چونکہ ہمیں ایک نیا فکر عطا کرتا ہے، اس لئے ہم اہل علم حضرات کو اس موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دیتے ہیں۔ (ادارہ)

سابقہ حکومت کے عہد میں قومی اسمبلی میں ایک اہم سماجی مسئلے پر بحث ہو رہی تھی جس کے قانون بن جانے کے بعد ہمارے غریب معاشرے کو ایک بہت بڑی سماجی برائی سے چھٹکارا پانے میں کافی مدد مل سکتی ہے، یہ بل جو اب قانون بن گیا ہے، رسم جہیز کی زیادہ سے زیادہ حد پانچ ہزار روپیہ مقرر کرنے کے بارے میں ہے، اس بل کی اصلاحی حیثیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حکومت کے مخالفین نے بھی اس کا استقبال کیا۔

ہمارے سامنے اس وقت نہ تو اس قانون کی تفصیلات ہیں اور نہ ہی ان پر تبصرہ کرنے کا کوئی ارادہ ہے، راقم تو رسم جہیز کے سلسلے میں ایک مشہور العوام غلط فہمی کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہے، جس پر آج کل بڑی محفلوں میں خوب خوب بحث ہو رہی ہے، جس دن یہ بل قومی اسمبلی میں پیش ہوا، اس سے اگلے دن راقم کو ایک ایسی شادی میں شرکت کرنے کا اتفاق ہوا جس میں کافی تعداد میں اہل علم شریک تھے، چنانچہ یہ فطری امر تھا کہ رسم جہیز کی شرعی حیثیت پر بحث ہو، اخبارات میں اس مسودہ قانون کے بارے میں جو خبر شائع ہوئی تھی اس میں اسے ایک ہندوانہ رسم اور سماجی برائی قرار دیا گیا تھا، بہت سے اہل علم کو رسم جہیز کے لئے ان الفاظ کے استعمال پر اعتراض تھا، کیونکہ ان کے خیال کے مطابق جہیز اگر مختصر اور سادہ ہو تو سنت نبوی ہے، اصل برائی اپنی حیثیت سے زیادہ قیمتی جہیز دینے میں ہے، چنانچہ ایک اہل علم جو اتفاق سے میرے کسی اللہ جہیز کی حد پر پابندی لگانے کا مسودہ پیش کرنے والے وفاقی وزیر کے علمی استاد تھے نے اپنے مسلک کی تائید میں یہ حدیث پیش فرمائی :-

"جہز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاطمۃ فی خمیل وقربۃ ووسادۃ حشوھا اذخر۔" (سنن نسائی جلد دوم مشہد مطبوعہ پاکستان)

(ترجمہ) یعنی حضورؐ نے حضرت فاطمہؓ کو تیار کیا ایک چادر، ایک مشکیزے اور ایک تکیہ، جس میں اذخر بھرا ہوا تھا۔

چنانچہ اس حدیث کے پیش کرنے کے بعد استاذ مکرم نے فرمایا کہ جب حضورؐ نے خود اپنی بیٹی کو جہیز دیا تو آپ لوگ اسے کیسے سماجی

برائی قرار دے سکتے ہیں ، دوسرے اہل علم نے بھی ان کی تائید کی
راقم نے ابھی جواب میں صرف یہی کچھ عرض کیا تھا کہ رسم جہیز کا سنت سے ثبوت ہوتا تو کم از کم عربی زبان میں صرف سے اس کے لئے کوئی لفظ تک تجویز کر پاتے ، واپسی کے لئے تیار ہو گئی جس کی وجہ سے ہم لوگوں کو بھی مجبوراً مجلس برخاست کرنی پڑی تاہم اٹھتے اٹھتے سب نے یہ فیصلہ کیا کہ اگلے دن استاذ مکرم کے مکان پر جمع ہوں جہاں دینی کتب کا کافی ذخیرہ موجود ہے ، اس سے کسی نتیجے پر پہنچنے میں آسانی ہو گی ۔

چنانچہ دوسرے دن حسب وعدہ سب حضرت استاذ مکرم کے مکان پر جمع ہوئے تو راقم نے بحث کا آغاز کیا کہ ہمارے یہاں رسم جہیز کے لئے جو لفظ جہیز استعمال ہوتا ہے ، وہ اگرچہ عربی زبان کا لفظ ہے لیکن اس کے معانی ہماری مروجہ رسم جہیز کے نہیں ، بلکہ اس سے مختلف ہیں ، چنانچہ جب مختلف عربی لغات کھول کر دیکھی گئیں تو اس لفظ جہیز کے مندرجہ ذیل دو معنی لکھے گئے تھے :-

۱- "الخفیف من الخیل" (ہلکا تیز رفتار گھوڑا)

۲- "موت سریع" (فوری مرگ)

اہل مجلس کے سامنے پہلے چونکہ لفظ جہیز کے مذکورہ بالا معانی نہیں تھے ، اس لئے اب انہوں نے میری بات کو توجہ سے سننا شروع کیا ، چنانچہ بندہ نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے عرض کیا کہ حضورؐ نے اپنی تمام صاحبزادیوں میں سے کسی کو بھی ان کی شادی کے موقع پر کسی قسم کا مروجہ جہیز نہیں دیا اور حضرت فاطمۃ الزہراء کے جس جہیز کے بارے میں استاذ مکرم نے اشارہ فرمایا ہے تو اس کی اصل حقیقت واضح کرنے کے لئے بندہ نے حاضرین مجلس کے سامنے سیرت النبی کی مشہور کتاب شرح زرقانی جلد دوم کا صفحہ تین کھول کر رکھ دیا جس میں حضرت فاطمہ کی شادی کے لئے ایک مستقل عنوان "ذکر تزویج علی بفاطمۃ رضی اللہ عنہا" قائم کیا گیا تھا اور اس کے نیچے مذکورہ جہیز کی تفصیل یوں بیان کی گئی تھی ۔

حتی اتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقلت تزوجنی فاطمۃ؟ قال اعندک شیء؟ فقلت فرسی ودرعی . قال اما فرسک فلا بد لک منها واما درعک فبعها فبعتها من عثمان بن عفان باربع مائۃ وثمانین درهما ثم ان عثمان رد الدرع الی علی فجاء بالدرع والدراهم الی المصطفی صلی اللہ علیہ وسلم ، فدعا لعثمان بدعوات کما فی روایۃ فجئت بها فوضعتها فی حجرہ فقبض منها قبضۃ فقال ای بلال ابتع لنا بها طیبا وفی روایۃ ابن ابی خیثمۃ عن علی امر صلی اللہ علیہ وسلم ان تجعل ثلث الاربعۃ مائۃ وثمانین فی الطیب فامرهم ان یجهزوها فجعل لها سریر مشرط ووسادۃ من ادم حشوها لیف

(شرح زرقانی مطبوعہ مطبع الازہر مصر ۱۳۲۵ھ ج دوم صفحہ ۳)

(ترجمہ) حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ یہاں تک کہ میں نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا کیا آپ حضرت فاطمہؓ کو مجھ سے بیاہنا پسند فرمائیں گے ۔ حضورؐ نے فرمایا کیا تیرے پاس کچھ مال ہے ، میں نے کہا کہ میرا گھوڑا ہے یا زرہ ، فرمایا گھوڑا ہے کی تو تجھے ضرورت ہے ، لیکن زرہ بیشک فروخت کر دو ، چنانچہ میں نے حضرت عثمان بن عفان کے پاس اسے چار سو اسی درہم میں فروخت کر دیا ، اس کے بعد حضرت عثمان نے وہ زرہ بھی واپس کر دی ، حضرت علی وہ زرہ اور اس کی قیمت لے کر حضور کی خدمت میں دوبارہ پیش ہوئے ، حضورؐ نے حضرت عثمان کے حق میں دعائے خیر فرمائی جیسا کہ وہ روایت میں ہے پھر میں نے وہ رقم حضور کو پیش کی جو آپ نے اپنی گود میں رکھ دی ، حضورؐ نے اس میں سے ایک مٹھی بھر کر فرمایا کہ بلال اس رقم کی خوشبو خرید کر ہمارے پاس لے آؤ ابن خیثمہ نے حضرت علی کی زبانی جو روایت بیان کی ہے ، اس کے الفاظ یوں ہیں کہ حضور صلعم نے حکم فرمایا کہ ان چار سو اسی دراہم کی ایک تہائی یعنی ایک سو ساٹھ درہم کی خوشبو خریدی جائے ، پھر حضورؐ نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت فاطمہ کا سامان مہیا کریں ، چنانچہ ان کے لئے ایک بنی ہوئی چارپائی اور ایک چمڑے کا تکیہ جس میں

کھجور کی چھال بھری تھی تیار کئے گئے ۔

حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی شادی کی ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے اپنی جیب سے ہمارے مروجہ رسم جہیز کی طرح کا کوئی جہیز نہیں دیا تھا، بلکہ حضرت فاطمہؓ کے لئے گھر کی ضرورت کا جو سامان مہیا کیا وہ مہر کی اس رقم سے تھا جو حضرت علیؓ نے شادی سے پہلے ادا کردی تھی، پھر یہ حقیقت بھی ذہن میں رہنی چاہیئے کہ حضورؐ نے یہ سامان صرف حضرت فاطمہؓ کے لئے تیار کروایا، اپنی دوسری صاحبزادیوں کے لئے تیار نہ کروایا اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی دوسری صاحبزادیاں جن گھروں میں بیاہی گئیں وہاں گھریلو ضرورت کا سامان پہلے سے ہی موجود تھا، اس لئے کسی قسم کے سامان کی تیاری کی ضرورت نہ سمجھی گئی، حضرت علیؓ کا پہلے سے کوئی گھر موجود نہ تھا، اور روایات میں ہے کہ ایک صحابی حضرت حارث بن نعمان انصاری نے اپنا ایک مکان انھیں پیش کیا جس کے لئے بہرحال تھوڑے بہت گھریلو سامان کی ضرورت تھی جو حضورؐ نے مہر کی اس رقم سے تیار کروادیا جو حضرت علیؓ نے شادی سے پہلے ادا کردی تھی ۔

آج سے پانچ چھ سال پہلے اسی موضوع پر ٹیلی ویژن پر ایک مختصر تقریر کے دوران راقم نے جب حضرت فاطمہؓ کے جہیز کے بارے میں مذکورہ بالا غلط فہمی دور کرنے کیلئے شرح زرقانی کی مذکورہ بالا عبارت کا حوالہ دیا تھا تو استاذ مکرم مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی صاحب نے میری کچھ مزید رہنمائی فرمائی ان دنوں وہ اہل سنت اور اہل تشیع کی متفقہ روایات کا ایک مجموعہ تیار کر رہے تھے، انھوں نے فرمایا کہ ائمہ اہل تشیع بھی حضرت فاطمہؓ کے جہیز کی بابت کچھ تفصیل بیان فرماتے ہیں، چنانچہ انھوں نے مجھے ایک شیعہ مولف کی کتاب ۔ ”روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیاء والملوک والخلفاء“ کا ایک حوالہ نقل کرایا جس کی اصل فارسی عبارت یوں ہے :-

”چوں حضرت علی فاطمہ زہراؓ را خواستگاری نمود حضرت رسول فرمود کہ مہر اورا چہ می سازی؟ جواب داد کہ نزد من چیزے نیست حضرت فرمود زرہ حطیہ تو کجاست؟ عرض کرد موجود است ۔ حضرت فرمود کہ آں را صداق ساز، گویند حضرت علی آں زرہ را بچہار صد و ہشتاد درہم بعثمان فروخت و آں زرہ بود فراخ و سنگین و تیغ شمشیر برو کارگر نبود، عثمان بعد از خریدن بحضرت علی بخشید و مرتضیٰ علی زرہ و بہائے آں کہ چہار صد و ہشتاد درہم بود بخدمت مصطفیٰ آورد و حضرت دربارۂ عثمان دعا فرمود، روایت آنست کہ دو دانگ وجہ مذکورہ را بوی خوش صرف کردند، و چہار دانگ دیگر در جہاز صرف رفت و آنچہ ازاں جہاز بود جامہ بردہ و دو بازو بند نقرہ و لحاف کتان و دو نہالے کہ ازاں یکی و حصیر و دو نہالے گفتہ اند، و بعضی از جہیزیات دیگر کہ محتاج الیہ بود ازاں زر مرتب ساختند ۔

(روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیاء والملوک والخلفاء مطبوعہ نولکشور لکھنؤ سنہ ۱۸۹۱ء جلد دوم ص ۲۶۳)

اہل مجلس کے سامنے جب حضرت فاطمہؓ کے جہیز کی یہ اصل حقیقت آئی تو وہ اس سے کسی حد تک متاثر نظر آئے کیونکہ یہ تمام حوالہ جات انھوں نے خود نکالے۔ اس کے بعد متعدد نے استاذ مکرم کی پیش کردہ حدیث کے بارے میں گفتگو کی کہ اس میں جو لفظ جہز استعمال ہوا ہے، اس کے معنی جہیز دینا نہیں بلکہ تیار کرنا ہے، چنانچہ لغت میں اس کے یہ معنی ملتے ہیں ۔ جھز فلانا ھیا لہ جھاز سفرہ ۔ یعنی فلاں کے لئے رخت سفر مہیا کیا ۔ جھاز الغازی ای اعد ما یحتاج الیہ فی غزوہ ۔ مجاہد کے لئے سامان حرب مہیا کرنا ۔

مختصر یہ کہ عربی زبان میں رسم جہیز کے لئے سرے سے کوئی لفظ ہی نہیں، غلط فہمی کی بنا جس لفظ کو ہم اس مقصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں، اس کے کچھ اور معانی ہیں، یعنی ہلکا تیز رفتار گھوڑا یا مرکب ناگہانی ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ جس زبان میں کسی رسم کے لئے سرے سے کوئی لفظ ہی موجود نہیں

(بقیہ صفحہ کالم ...)

# اِک ولولۂ تازہ دیا جس نے دلوں کو

## اخوانی آرگن کا نمائندہ — مولانا مودودی کی خدمت میں

اخوانیوں کے ہفت روزہ آرگن الدعوہ کے نامہ نگار حامد رزق نے مولانا مرحوم کی وفات سے کچھ ہی پہلے یہ انٹرویو لیا، جو "الدعوہ" ۱۵ اگست کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔ ہم الدعوہ کے شکریے کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ نذرِ قارئین کر رہے ہیں۔

نمائندہ الدعوہ :- موجودہ اسلامی تحریکوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے اور مستقبل میں ان پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

مولانا مودودی :- دورِ جدید میں اسلامی تحریکوں نے اسلام اور مسلمانوں کی زبردست خدمات انجام دی ہیں، خاص طور سے انھوں نے اسلام کا صحیح تصور جو بادلوں کی اوٹ میں چھپ چکا تھا، اجاگر کیا اور اسلام کو جو محض چند مبہم عقائد کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے ایک مکمل نظامِ حیات کی روپ میں پیش کیا جس میں عقائد سے لے کر بین الاقوامی قوانین صلح و جنگ تک تمام جزئیات کی تفصیلات موجود ہیں۔

دورِ حاضر کی اسلامی تحریکوں نے تعلیم یافتہ طبقہ میں اپنے کافی اثرات چھوڑے ہیں، ان کی توجہ دعوتِ اسلامی کی طرف مبذول کی ہے اور اب اسلامی تحریکوں کی ذمہ داری ہے کہ اسلام کی نشر و اشاعت اور دعوتِ اسلامی کو مزدوروں کسانوں اور عوام تک پہنچانے کے لیے تعلیم یافتہ طبقہ کی خدمات حاصل کریں تاکہ ہر طبقے کے لوگ متحد ہو کر دعوت کو آگے بڑھا سکیں، اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں موثر رول ادا کر سکیں اور تمام شعبوں پر مشتمل ایک اسلامی تنظیم وجود میں آسکے۔

مستقبل میں اسلامی تحریکوں کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ باصلاحیت افراد کی ایسی ٹیم تیار کریں جو اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کے ذریعہ زندگی کے مختلف شعبوں میں قوم کی رہنمائی کر سکیں۔

نمائندہ :- غیر اسلامی نظام کو مٹا کر اسلامی نظام نافذ کرنے کیلئے موجودہ دور میں اسلامی تحریکوں کیلئے سب سے بہتر اور موزوں طریقہ کیا ہے؟

مولانا :- اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ باطل افکار و نظریات کا حق سے، غیر اسلامی سیرت و کردار کا اسلامی سیرت و کردار سے، گندی سیاست کا اسلامی سیاست سے غلط نظریات علوم و سائنس کا فطرت پر مبنی علوم و سائنس سے مقابلہ کیا جائے، نئی نسل کی اسلامی خطوط پر تربیت کی جائے اور اس کے اندر ایمان و یقین اور شجاعت و غیرت کے جذبات پرورش کئے جائیں۔

نمائندہ :- کیا یہ ممکن ہے کہ عالم اسلام کی تمام اسلامی تحریکات ایک لڑی میں پروجائیں ؟ اور اس کی عملی شکل کیا ہوگی ؟

مولانا :- ہاں نظریاتی اور ثقافتی سطح پر تمام تحریکوں کا اتحاد ممکن ہے، بلکہ انھیں ضرور ایک پلیٹ فارم پر آجانا چاہئے، لیکن موجودہ دور میں حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے انتظامی امور میں ان کے اتحاد کی گنجائش مشکل ہے، لیکن ابتدائی خطوط پر تو وحدت ضرور عمل میں آجانی چاہئے۔

نمائندہ :- آیت اللہ خمینی اور ایرانی انقلاب کے سلسلے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔

مولانا :- علامہ خمینی کا لایا ہوا انقلاب خالص اسلامی انقلاب ہے، اس کے برپا کرنے والے وہ نوجوان ہیں جنھوں نے اسلامی تحریکوں سے تربیت حاصل کی ہے۔ اور تمام مسلمانوں کی اور خاص طور سے اسلامی تحریکوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس انقلاب کی بھرپور تائید کریں اور ہر شعبہ میں اس کا تعاون کریں۔

نمائندہ :- کیا قوم کو آمادہ کرنے سے پہلے اسلامی شریعت کا نفاذ ممکن ہے ؟

مولانا :- دونوں کام بیک وقت انجام پائیں گے شریعت ہی قوم کو آمادہ و تیار کرے گی، پھر ذرائع نشرو اشاعت کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ فضا ہموار کرنے میں بھرپور مدد کریں۔

نمائندہ :- دور جدید میں عورتوں کے مسائل کیسے حل کئے جائیں؟ ان کے سدھار کے لئے کیا تدبیر عمل میں لائی جائے۔

مولانا :- اصلاح و تربیت کو مسلم سوسائٹی میں دو قسم کی خواتین موجود ہیں، ان میں کا ایک گروہ دین کا محافظ اور مغربیت سے بیزار و کنارہ کش ہے، لیکن دوسری قسم تحریک نسواں سے متاثر اور سیاسی و معاشی مساوات کی علمبردار ہے، اسلام نے خواتین کو اللہ نے جو حقوق و اختیارات عطا کئے ہیں ہم ان کی بھرپور حفاظت و نگہداشت کریں اور مغرب زدہ عورتوں کی اصلاح و تربیت کے ذریعہ اور اسلامی حقوق عطا کرکے رشد و ہدایت کی راہ پر لانے کی کوشش کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کو جتنے حقوق و اختیارات عطا کئے ہیں اور ان کی جس قدر عزت افزائی فرمائی ہے، کسی انسانی نظام نے اب تک اتنے حقوق نہیں دئے اور نہیں آنحضور کی اس وصیت کو گرہ سے باندھنی چاہئے، جب آپ نے ایک سفر میں خواتین کے سلسلے میں فرمایا تھا "علیکم بالقواریر" - یہ آبگینے ہیں، دیکھو انھیں ٹھیس نہ لگنے پائے۔

جہاں تک پردے کا مسئلہ ہے تو یہ حکمت کے خلاف ہے کہ عورتوں پر قانون و اقتدار کے ذریعہ پردہ کو مسلط کیا جائے بلکہ بہتر یہ ہے کہ فضا کو اس قدر ہموار اور دینی تعلیمات سے معطر کر دیا جائے کہ عورت اپنی اندرونی انگیخت اور ضمیر کی پکار سے مجبور ہو کر پردہ کی خوشبو میں بس جائے، لاہور طبیہ کالج کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے، ان میں ۹۰ فیصد طالبات پردہ کو ناپسند کرتی تھیں، لیکن جمعیۃ الطالبات کی لوکل یونٹ نے ہفتہ واری ملاقاتوں میں گفتگوؤں اور تقریروں کے ذریعہ فضا کو ہموار بنانا شروع کر دیا اور صرف دو سال کی قلیل مدت میں نوے فیصد طالبات نے اندرون کی پکار پر لبیک کہا اور پردے کی پابند ہو گئیں۔

مولانا مودودی نے مزید فرمایا :-

جدید عورت کو ہمیں اچھی طرح سمجھانا ہوگا کہ مغربی تہذیب جس کے دام ہمرنگ زمین کا تم شکار ہو گئی ہو تمہارا استعمال کر رہی ہے، تمھیں اپنے مفادات پر بھینٹ چڑھا رہی ہے یہ تہذیب تمہاری انسانیت اور نسوانیت کو چوس لینا چاہتی ہے، اس کی نگاہیں حرص و ہوس اور شہوت [illegible]

ہوتی ہیں، وہ تم سے لطف اندوز ہونا تو چاہتی ہیں لیکن تمہاری عزت و تکریم سے غافل ہیں، جبکہ اسلام تم کو انسانیت کے مقام رفیع تک لے جانا چاہتا ہے، تمہیں تہذیب و تمدن کی گاڑی کا ایک پہیہ کہتا ہے جس سے بے نیاز نہیں ہوا جا سکتا۔

نمائندہ:۔ عالمی تحریکات اسلامی کے متعلق نوجوانوں کے نام آپ کا پیغام؟

مولانا:۔ میں موجودہ صدی کے آغاز سے دعوت اسلامی میں منہمک رہا ہوں اور اب یہ صدی ختم ہوا چاہتی ہے۔ اے ملت کے نوجوانو! میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں، تم آنے والی صدی کو اسلام کی صدی بنا دو اور آج تمام ہی علامات اور دلیلیں بتا رہی ہیں کہ آئندہ صدی اسلام کی صدی ہوگی، اس لئے کہ بوسیدہ تہذیب اب گرنے کو ہے اور انسانیت کی زندگی میں ایک زبردست خلا پیدا ہونے کو ہے، اس خلا کو صرف اسلام ہی پُر کر سکتا ہے تو تم اس خلا کو پُر کرنے کیلئے سر دھڑ کی بازی لگا دو، اور صبر و ثابت قدمی کو اپنا شعار بنا لو، یہ دونوں کلمے بظاہر ہلکے ہیں لیکن میزان انجام میں بہت بھاری ہیں اور تاریخ میں ان دونوں کلمات کے مفید نتائج کا ہم مشاہدہ کر چکے ہیں "ولا ینبئک مثل خبیر"۔

---

## الوداع!

الوداع اس شخص کو کہنا کوئی آسان نہیں
سخت مشکل کام ہے یہ پھر بھی ہمت کیجئے
آنسوؤں کے پھول برسا کر دلوں کو تھام کر
قائد تحریک اسلامی کو رخصت کیجئے

تو اس کا وجود کہاں ہوگا، چنانچہ نہ تو ہمیں زمانۂ جاہلیت میں اس کا کوئی رواج ملتا ہے اور نہ مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں دورِ نبوی میں تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ سیرت النبی، تاریخ اور محاضرات کی کتابوں میں ہمیں ہزاروں شادیوں کا ذکر ملتا ہے جن میں سے بعض شادیوں کی تو پوری تفصیلات درج ہیں، لیکن اگر کسی چیز کا ذکر نہیں ملتا تو وہ رسم جہیز ہے۔

تاہم ہماری اس وضاحت سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام میں لڑکیوں کو کچھ دینا منع ہے، والدین پیدائش سے لیکر جوانی تک اپنی بچیوں کو بہت کچھ دیتے رہتے ہیں اور شادی کے بعد بھی وہ ایسا کرتے رہتے ہیں اور کر سکتے ہیں، سوال یہاں رسم جہیز کے بارے میں ہے کہ وہ کسی طرح سنت رسول نہیں، وگرنہ حضور ضرور اپنی صاحبزادیوں کو جہیز دیتے، لیکن آپ نے تو غریب والدین کی سہولت کے لئے امت مسلمہ کیلئے ایک بہترین اور قابل تقلید مثال پیش کی کہ جس پر عمل کرنے سے ہمارے ہاں کی مروجہ رسم جہیز کی برائی ختم ہو سکتی ہے، اس کے باوجود بھی اگر بعض حضرات رسم جہیز کو سنت رسول قرار دینے پر مصر ہیں تو کم از کم وہ اسی عمل ہی کو سنت رسول قرار دیں کہ جو حضور نے حضرت فاطمہؓ کی شادی کے سلسلے میں کیا کہ اس نئے گھر کو بسانے کے لئے تمام ضروریات کی چیزیں مہر کی اس رقم سے خریدی گئیں جو حضرت علیؓ نے پیشگی ادا کر دیا تھا، ہمارا یقین ہے کہ اگر اس سنتِ رسول پر حضورؐ کے اپنے عمل کے مطابق عمل کیا جائے تو پھر بھی ہمارے ہاں کی مروجہ رسم جہیز کی سماجی برائی فوری طور پر ختم ہو سکتی ہے۔

**شکایت** ہمارے بہت سے خریداروں کو رسالہ نہ ملنے کی شکایت ہے جس پر ہمیں شدید افسوس ہے۔ ہر ماہ پابندی سے تمام خریداروں کو رسالہ روانہ کر دیا جاتا ہے۔ آپ مقامی ڈاکخانہ کی طرف رجوع کریں۔

ڈاکٹر ہیری ایمرسن فاسڈک

مولانا عبدالحکیم ایم۔ اے، بی ایڈ
(استاذ جامعۃ الفلاح)

# مردِ کامل بننے کا مسئلہ

یہ مضمون ریڈرز ڈائجسٹ فروری سنہ ۱۹۶۶ء کے OUR BEING A REAL PERSON ——— کا اردو ترجمہ ہے، مضمون نگار نے شخصیتوں کی تعمیر پر کافی مدلل انداز میں بحث کی ہے۔ ہم مولانا محترم کے ممنون ہیں کہ آپ نے اس کا اردو میں ترجمہ کر کے حیاتِ نو کے قارئین کے لئے استفادہ کا موقع عنایت فرمایا۔ (ادارہ)

ہر انسان کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایک حقیقی شخصیت کا مالک بنے، فطری طور پر وہ تمام عناصر ہمارے اندر موجود ہوتے ہیں جن سے شخصیتوں کی تشکیل ہوا کرتی ہے اور ہم میں سے ہر انسان کی ذمہ داری ہے کہ زندگی میں ان عناصر کو اس طرح ترتیب دے کہ ایک منفرد شخصیت رونما ہو سکے، ایک منفرد اور ممتاز شخصیت جلوہ آرا ہو جائے۔

بغیر کسی مبالغہ کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دل شکستہ اور غمزدہ حضرات جو کشمکش حیات سے بچکر چلنا چاہتے ہیں، رزمگاہِ عالم کا سب سے بڑا المیہ ہیں، محلوں اور جھونپڑیوں میں یونیورسٹیوں اور غیر تعلیم یافتہ حلقوں میں زندگی کے ہر میدان میں وہ لوگ جن کی اولین ذمہ داری تھی کہ اپنی شخصیتوں کی عمدہ تشکیل کریں، دونوں ہاتھوں سے اپنے آپ کو پوری طرح تباہ و برباد کرتے ہیں اور نتیجۃً وہ اوندھے منہ ایک نئی دوزخ میں جا گرتے ہیں

شخصیت کی تعمیر میں تین عناصر کی کارفرمائی ہوتی ہے

توریث - ماحول اور ذاتی جدوجہد -

توریث کے باب میں ہم قطعاً ذمہ دار نہیں -

ماحول پر بھی ایک حد تک ہمارا قابو چلتا ہے -

لیکن معرکۂ حیات میں ایک اولوالعزم مبارز کی حیثیت سے قدم رکھنا ہم میں سے ہر ایک کی خصوصی ذمہ داری ہے - لیکن جب کوئی اپنے کو بیکار کا یقین کرتے ہوئے یہ ذمہ داری قبول کرتا ہے تو پھر اس کا کام صرف اتنا ہی رہ جاتا ہے کہ مقابلۂ حیات سے گریز و فرار کے لئے عذر تراشا کرے -

الزام سے بچنے کی خواہش اول اول سب سے نچلی سطح پر قسمت کے لکھے پر ذمہ ڈال دیتی ہے، لوگ کہتے ہیں کہ کرکٹ کی گیند تو خوش قسمت کھلاڑی کی گود میں از خود آ گرتی ہے اور ناکامیوں کا سبب شخصی غلطیاں نہیں ہوتیں، بلکہ اتفاقات ہوتے ہیں قسمت کے لکھے سے تو خیر کوئی انکار نہیں کر سکتا، حیات انسانی میں اس کا نہایت اہم کردار ہے لیکن بالیقین روئے زمین کا سب سے شاندار واقعہ، ان "بدقسمت" لوگوں کا وجود ہوتا ہے

جو کبھی کبھی ہر لحاظ سے حقیقی اور بھرپور شخصیت کے مالک ہوتے ہیں زندگی کے نشیب و فراز میں حادثات زیادہ فیصلہ کن حقیقت نہیں ہوتے بلکہ ان کا وہ رویہ اور طرز نظر ہوتا ہے جس کے ذریعہ وہ عہدہ برآ ہونا چاہتے ہیں

ایک میل کی دوڑ کا چیمپین گلن کننگھم Glenn Cunningham اسکول میں آتشزدگی کے نتیجہ میں جل کر ہاتھ پیر سے معذور ہو گیا تھا، ڈاکٹروں کا اتفاق تھا کہ اسے دوبارہ چلنے پھرنے کے قابل بنانے کے لئے ایک معجزہ کی ضرورت ہے، لیکن ہمت مردانہ کا کمال دیکھئے، چلتے ہوئے ہل کے دستے سے لٹک کر گلن نے گھسٹنے کی کوشش کی، پھر جب زمین پر ٹکنے لگے تو اور مشق بڑھائی اور پھر واقعی معجزہ رونما ہو کر رہا، اس نے ایک میل کی دوڑ کے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دئے۔

"بدقسمتی" فی الواقع کوئی عذر نہیں جس طرح تنہا "خوش قسمتی" حقیقی شخصیت کی ضامن نہیں بن سکتی۔

بہت سے لوگ شخصی ذمہ داری کے احساس سے بھاگ کر جذباتی قسمت پرستی کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، اگرچہ یہی سہی لیکن یہ کیفیت زندگی کے لئے سکون بخش تو ضرور ہوتی ہے، آدمی اگر کل کے پرزے کی طرح مجبور محض ہے تو پھر اس پر کیا ذمہ داری عائد ہو سکتی ہے۔ زیادہ بلند سطح پر ذمہ داریوں سے بچنے کی خواہش کا اظہار اسی طرح ہوتا ہے کہ آدمی شخصی اوصاف و خصوصیات کو قانون توریث اور ماحول کے سر ڈال دیتا ہے، عقل و فراست کی داخلی مقدار سے لے کر خارجی ماحول کے ظلم و جبر تک ایک کے لئے یہ نظریہ بہترین نظریہ پیش کرتا ہے، لیکن مشکلات کو حل کرنا اور ناسازگار کو سازگار بنانا، زندگی کا سب سے جلیل القدر منصب ہے کامیابی حاصل نہ ہونے کا سبب اکثر خود فرد کے اندر ہی موجود ہوتا ہے لیکن متعلقہ حضرات کے لئے اس کا اعتراف مشکل ہوتا ہے۔

ایک بار ایک کسان بڑی مشقت سے اپنی گھوڑا گاڑی گرد و غبار سے بھری ہوئی ایک سڑک پر چڑھا جا رہا تھا، وہ جس کو ڈر تھا کہ، یہ پہاڑی کا راستہ ابھی کتنا باقی ہے؟ اس نے پوچھا۔ جواب ملا "پہاڑی؟ یہاں پہاڑی کہاں؟ تمھاری گاڑی کے پچھلے پہیے ہی تمہارا [illegible] ہیں۔"

کبھی کبھی ہم میں سے ہر ایک اسی کسان کے مشابہ ہوتا ہے۔ دنیا ایک دشوار مقام ہے اور لوگ اکثر انصاف سے کام نہیں لیتے، بلکہ ظالم اور خود غرض ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی ہم ان دو شخصوں کا فرق بخوبی سمجھتے ہیں جن میں سے ایک کے پاس ہر بات کے لئے کوئی نہ کوئی عذر ضرور موجود رہتا ہے اور دوسرا ٹھیک انہیں دشوار حالات میں پڑ کر جادۂ اپنے اندرون پر نظر ڈالتا ہے اور اپنے طرز عمل اور اپنے وسائل کا جائزہ لیتا ہے، کوئی عذر نہیں کسی پر الزام نہیں، وہ ہر حال میں اپنے لئے سب سے بڑا مسئلہ اپنی ذات کو سمجھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ اگر اس نے اپنی ذات کا صحیح استعمال کیا تو لازماً بہتر نتائج حاصل ہوں گے۔ ہر شخص اس لڑکے کے صاف اور سلجھے ہوئے ذہن کا اعتراف کرے گا جس نے ایک فٹ بال میچ میں ہارنے کے بعد اپنے باپ کو لکھا تھا کہ ہمارے مخالفین کو ہماری دفاعی لائن میں ایک زبردست شگاف مل گیا تھا اور وہ شگاف میں ہی تھا۔

جب ہم کامیاب ہوتے ہیں اور جب صحیح فیصلہ اور مناسب کوشش کے نتیجہ میں ہمیں اپنا مقصود مل جاتا ہے تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس ساری جد و جہد میں ہمارا رول اہم رہا ہے، اسی طرح جب ہم ناکام ہوں تو ذمہ داری سے کیونکر بچ سکتے ہیں؟ آدمی کی زندگی تو شروع ہی اس وقت ہوتی ہے جب آدمی خود اپنا مقابلہ آپ کرنا سیکھ جاتا ہے۔ ہم میں ہر شخص بے نظیر پیدا ہوا ہے اور ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنی شخصیت کی تکمیل و ترتیب میں ہر امکانی کوشش سے کام لے۔ پھر بھی بکثرت لوگوں کا یہ حال ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی مسائل سے خود نمٹنے سے پہلے ہر ممکن القیاس عذر اور بہانے سے جنگ چھیڑ دیتے ہیں۔

ہمارے دور کا انسانی المیہ ایک کارٹون بہت موثر طور پر پیش کرتا ہے۔ ایک ڈاکٹر مریض پر بڑی تشویش کے ساتھ نگاہ ڈالتا ہے اور کہتا ہے۔

This is a very serious case
I am afraid you are allergic
to your self.

(یہ صورتحال بہت سنگین ہے، تم تو اپنا مرض آپ ہو)

## پہلودار شخصیتیں

بول چال میں یہ جو ہم شخصیت کی تعمیر کے الفاظ بولتے رہتے ہیں تو یہ حقیقت حال کی صحیح تعبیر نہیں۔ ذات کسی تعمیر کے بجائے بہتے دریا کے مشابہ ہے اور ذات اور شخصیت کے مالک ہونے کے معنی انا کی تنظیم و ترتیب میں برابر مشغول رہنے کے ہیں۔ مختلف حالات میں زندگی بسر کرنے والے دو آدمیوں کے معاملے میں کامیاب شخصیت کا معیار یکساں نہیں ہو سکتا۔ یہ معیار ایک ہی شخص کے باب میں عمر کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ ایک معیار البتہ ایسا ہے جس پر سب متفق ہیں۔ ایک حقیقی شخصیت کا مالک اپنے وجود میں مکمل وحدت اور اتحاد محسوس کرتا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کا سامنا کبھی نہ کبھی غیر منتظم زندگی کے مسائل سے پڑتا ہو۔ اس پریشان حال آدمی کو دیکھئے جو محض اتنی سی بات پر سخت جوش و ہیجان کا شکار ہو جاتا ہے کہ چشمے اس نے بھول کر غلط جگہ رکھ دیے تھے۔ پھر ایک خوف زدہ آدمی ہے جو خوف سے بے حال ہو کر ہوش و حواس ہی کھو بیٹھتا ہے۔ بعض لوگ اتنے تند مزاج ہوتے ہیں کہ معمولی سی بات پر برس پڑتے ہیں، یہاں تک انھیں اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔

یہ ساری مثالیں واضح طور پر اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ہماری شخصیت کی تالیف و تنظیم کتنی بودی ہے۔ اعلیٰ کردار کے جملہ اوصاف میں سب سے اہم اس کا قابل اعتماد ہونا تسلیم کیا گیا۔ یہ قابل اعتماد ہونا اسی وقت ممکن ہے جبکہ شخصیت کی تالیف و ترتیب اس طرح کی گئی ہو کہ وہ ایک کامل و مکمل وحدت کے سانچے میں ڈھلی ہو۔ بہت سے لوگوں کا طرز عمل بسا اوقات ایسا ہوتا ہے جس سے بے کرداری ٹپکتی ہے۔ ہماری زندگی کا عمومی معیار، دیانتداری صداقت اور اسی طرح کی دوسری صفات پر مبنی ہو سکتا ہے لیکن بعض اوقات ہمارا طرز عمل ان صفات کی ضد بھی بن جاتا ہے۔ یہ حقیقت شائستگی اور اخلاق جیسی عام صفات کے باب میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ بکثرت ایسے لوگ ملتے ہیں جن کی شائستگی اور حسن اخلاق پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ہم انھیں اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ آج خلیق اور شائستہ اور کل بد خلق اور ناشائستہ، کام پر خوش اطوار اور با مروت، گھر میں چڑچڑے اور روٹھے رہتے ہیں۔

ایک صاحب کردار انسان کے وظائف حیات نہایت درجہ منضبط اور منظم ہوتے ہیں۔ آدمی ان پر پوری طرح بھروسہ کر سکتا ہے۔ اس کے جذبات، خواہشات اور خیالات تنگ یا ترنگ نہیں ہوا کرتے۔ وہ ایک سالم اور کامل شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ اس کے خیالات و عقائد سب کا تانا بانا ایک وحدت کی لڑی میں پرویا ہوا ہوتا ہے۔ اس طرح اس کے جملہ احوال و اعمال میں ضبط، متانت اور وقار کی جلوہ گری ہوتی ہے۔

ایک مرتب اور منضبط زندگی کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ ہر طرح کی کشمکش سے نجات مل گئی ہے اور مکمل طور پر اطمینان اور سکون حاصل ہو گیا ہے۔ بہت سی عظیم شخصیتیں اندرونی کرب اور بے چینی کا شکار رہیں۔ ایک فلورنس نائٹینگیل پر ایک زمانہ سخت مایوسی اور رنج کا گزرا ہے۔ وہ اپنی ڈائری میں لکھتی ہے کہ میں زندگی کے اس اکتیسویں سال میں بجز موت کے کسی شے کو عزیز و محبوب نہیں پاتی۔ ہر مضبوط دل کے انسان کے اندر دل میں شدید کشمکش اور مقابلہ موجود ہوتا ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو ڈھیلا نہیں چھوڑ دیتا ہے

لوگ اپنی زندگیوں کو جو اعلیٰ قدروں کے سانچے میں ڈھال چکے ہوتے ہیں، ایک متعین مقصد حیات ہوتا ہے اس کی طرف بڑھ رہے ہوتے ہیں، اس طرح ایک حقیقی شخصیت کا حصول جس طریقے سے ہوتا ہے، وہ سرتا سر داخلی اور روحانی طریقہ ہے، ایک وفا کیش اور عیب پیشہ گھرانے کا نہایت درجہ سازگار ماحول بھی کسی فرد کو اپنا مقابلہ آپ کرنے سے مستثنیٰ نہیں کر سکتا اور جہاں تک نری مادی خوشحالی کا تعلق ہے وہ تو زندگی کو منظم اور مزین کرنے کے بجائے اکثر منتشر اور بے ہودہ بنا دیتی ہے، اعصابی جنسی مسائل

تو آسودہ حال لوگوں کا نمایاں

وصف ہے

## جنگ اندروں

ایک ناولسٹ اپنے ایک کردار کا حال یوں بیان کرتا ہے "وہ انسان اس قدر نہیں تھا جتنا کہ خانہ جنگی کا پتلا" کبھی کبھی تو ہر ایک آدمی اپنے آپ کو اسی صورت حال کو دوچار پاتا ہے جس میں ایک طرف تو وہ خود اپنی واقعی قوتوں اور قابلیتوں کے ساتھ ماحول کے تقاضوں کی نذر ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کی اور اس کے کارناموں کی اپنی ہی بنائی ہوئی ایک آئیڈیل تصویر ہوتی ہے اور دونوں کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج حائل ہوتی ہے۔

بےشک انسان کی عظمت اعلیٰ آئیڈیل اور بلند حوصلے ہی تو ہیں اور شخصیت کے ارتقاء میں توازن کا درس سب سے اہم ہے لیکن انسان جس ان کے لئے اتنا غیر معتدل طرز عمل اختیار کرتا ہے، زندگی ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔

کوئی مرتب اور منظم شخصیت ممکن ہی نہیں جب تک

آغاز کار کے طور پر خود پذیری

کا عمل رونما نہ ہو جائے یعنی آدمی یہ کہے: "میں مشتی جان آج سے اس اعلان کے ذریعہ قبول کرتا ہوں اپنے آپ کو اپنی تمام موروثی صلاحیتوں اور کمزوریوں کو اور ماحول کے ان تمام عناصر کو جن پر میرا قابو نہیں ہے، یہ سب قبول کرتے ہوئے اب میرا فرض یہ ہے کہ دیکھوں اس جان ماحصل کے ساتھ کیا کر سکتا ہوں۔

ہم جیسے کچھ ہیں اور جو کچھ ہونا بننا چاہتے ہیں ان دونوں میں اعلیٰ اخلاقی آئیڈیل کی بنا پر کشمکش لازمی ہے اور اکثر اسی موقع پر اس آئیڈیل کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایثار اور وفاداری بڑی نمایاں شمار ہوتی ہیں مگر ایک لڑکی جو ایک ضرورت سے زیادہ اقتدار پسند ماں کے تسلط اور نگرانی میں ہے، اپنے بارے میں یوں بھی سوچ سکتی ہے کہ ایثار و وفا تو اس کے فرائض زندگی میں سے ہے، اس طرح وہ ایک طرف نہ تو اپنی ماں ہی کی کوئی واقعی خدمت کر سکتی ہے اور نہ اپنی زندگی کو یکسر منتشر کردہ جانے سے بچا سکے گی اور دوسری طرف خود آپ اپنی شخصیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے گی

## احساس کمتری

خود پذیری

اگر عمل میں نہ آ سکی ہو تو حقیقی شخصیت اور آئیڈیل یا تخیل انا کے درمیان سخت کشمکش برپا ہو جاتی ہے، جس کے نتیجہ میں ایک کچل ڈالنے والا احساس کمتری پیدا ہوتا ہے، یونیورسٹی کے ۵۰۰ طلبہ کے معائنہ کے بعد معلوم ہوا کہ ۹۰ فیصدی سے زیادہ ان میں کے عدم تسکین اور جانگداز احساسات کا شکار تھے انہوں نے ہر طرح کے عذر بیان کئے، مثلاً جسمانی صلاحیتوں میں کمزوری، غیر دلکش صورت، محبت میں ناکامی، ذہنی افلاس، سماجی اوصاف سے محرومی، اخلاقی کوتاہیاں وغیرہ وغیرہ احساس کمتری کے مسئلہ کی اہمیت اسی وجہ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ عموماً لوگ اس سے بچنے کے لئے ناپسندیدہ طرز عمل اختیار کرتے ہیں، بعض تو

Smoke screen

بعض گنہگار نے نفاق کا طریقہ اپنا لیتے ہیں۔ اس کمزوری کے مارے ہوئے یہ بھی نہیں چاہتے کہ دوسرے ان کے حال سے واقف ہوں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جوشیلے ہو گئے ہیں، یہ تصنع جھگڑالو بننے کی کوشش کرتے ہیں بوکھلائے ہوئے بے تکان لفظ پر جھاڑنا شروع کر دیتے ہیں، بزدل ڈینگ مارنے اور کلہ درازی پر آمادہ ہو جاتے ہیں، ایک شخص کو جو اپنے افراد خاندان کے معاملہ میں نہایت نرم خو اور بامروت تھا، ایک ذلت آمیز ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، ایک دم سے وہ سخت گیر اور اقتدار پسند ہو گیا، یہاں تضاد کا انکار تو نہیں کیا جا سکتا مگر واقعہ یہ ہے کہ جب اس میں ذاتی بلندی اور برتری کا احساس تھا اس کا طرز عمل تواضع اور خاکساری کا تھا، گویا انواضع اسے اپنی کمتری کا احساس ہے، لیکن جو نہی اسے کمتری کا ذاتی احساس ہوا دھونس جمانی شروع کر دی اور تحکم پسند بن گیا، بہتوں کا حال آصف الحکیم کی افسانوی لومڑی کا ہوتا ہے، ان کے نزدیک وہ تمام انگور جو ان کی دسترس سے باہر ہوں لازماً کھٹے ہوتے ہیں، کمزور نوجوان کسرتی اور موزوں جسم والے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ آوارہ منش، محتاط اور پرہیزگار کو "ننھے والا اور رنگے سیار" کا طعنہ دیتا ہے۔ اسکول میں فیل ہونے والا ذہین طلبہ کو حقارت سے پیش آنے والا کہتا ہے۔ غور سے دیکھئے لوگ کن چیزوں سے خواہ مخواہ بیزاری کا اظہار کرتے ہیں، پھر یقینی طور پر آپ جان لیں گے کہ ان کی حقیقی محرومیاں کیا ہیں اور کس چیز کے وہ تحت الشعور میں متمنی رہتے ہیں۔

کچھ اور لوگ مبالغہ آمیز اعتراف تقصیر کو بطور پناہ گاہ استعمال کرتے ہیں، ایک طالب علم جو ایک آدھ بار فیل ہو گیا تھا، کہنے لگا، میں نے اپنے معاملہ میں بار ہا غور کیا، بالآخر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں ہو ہی کند ذہن ہوں۔ اس کے اس قول میں کسی تلخی اور مایوسی کا شائبہ تک نہ تھا، بلکہ یہ اعتراف اس کے حق میں بڑا سکون بخش ثابت ہوا، یہ ایک بے خطا بہانہ تھا، اس کے ذریعہ وہ ہر طرح کی ذمہ داری سے بری ہو گیا، لیکن بہ اعتبار حقیقت یہ عذر سراسر لغو تھا اور جذباتی بے اعتدالی کا پتہ دے رہا تھا۔

صحیح اور صحت مند شخصیت کی نشوونما میں خود پذیری کو جو چیز مثبت طور پر اولین اور بنیادی درجہ عطا کرتی ہے وہ اصول تلافی کی کارفرمائی ہے۔ نقص اور خامی کبھی کبھی قوت محرک کا کام بھی کر جاتے ہیں، سادہ اور سپاٹ لڑکی اس احساس سے کام لے کر کہ وہ سادہ اور سپاٹ ہے، اپنے اندر زیادہ پرکشش اور ذکاوت و ذہانت پیدا کر سکتی ہے، خوش سلیقہ اور منظم نوجوان جو جنسی عوامل سے خائف اور گوشہ گیر ہے، سائنٹیفک تحقیقات اور ریسرچ کے کاموں میں کہیں زیادہ مفید اور موزوں ثابت ہو سکتا ہے، خود پذیری کے سلسلہ میں آغاز کار کے طور پر اولین قدم یہ ہے کہ وہ امور جو آزار جان بنے ہوئے ہیں ان کی تعداد اور تاثیر ممکن حد تک گھٹانے کی کوشش کی جائے۔

کارٹونی چہرہ، مطلوبہ صلاحیتوں سے محرومی، مالی دشواریاں یہ سب جکڑبندیاں، پابندیاں اور قیود ہیں، مگر یہ ہمارے لئے ذلت کا سبب ہرگز نہیں، ذلت یہ اسی وقت ہوتی ہیں جب ہم اندرونی طور پر انھیں ذلت بنا لیتے ہیں۔

زندگی ایک طرح کی باغبانی ہے، ہمیں ایک قطعہ زمین وسیع یا مختصر دے دیتے ہیں، کبھی وہ ہموار بھی ہوتی ہے اور کبھی ناہموار، لیکن اسے سرسبز و شاداب کرنا ہماری اپنی ذمہ داری ہے، کامیابی اور ناکامی کے امکانات ہر قطعہ زمین سے وابستہ ہوتے ہیں لیکن محنت اور عمل کی بدولت اکثر سب سے زیادہ غیر متوقع نتائج حاصل ہوتے ہیں بعض قطعے درجہ شاندار ممکنات ابتدا میں نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں

اور کبھی یاس کن صورت حال امید افزا توقعات سے بدل جاتی ہے۔ شخصیت کے اجزائے ترکیبی بالکل ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے کسی قطعہ ارضی کے اوصاف و مضمرات۔ اب یہ اپنی اپنی محنت و مشقت ہے کہ چاہیں اسے باغ و بہار بنا دیں اور چاہیں چٹیل میدان چھوڑ دیں۔ پس شخصیت کی کمزوریوں، کوتاہیوں اور امکانات کو ذلت یا رسوائی سمجھ کر نہیں بلکہ نئے مواقع اور محرکات سمجھ کر قبول کرنا چاہئے۔

ایک باصلاحیت خاتون کو میں جانتی ہوں جن کی نشو و نما افلاس اور تنگدستی کے ماحول میں ہوئی تھی۔ اپنی ابتدائی زندگی کا ایک واقعہ ان کو یاد تھا جبکہ انہوں نے اپنی مشکلات کا شکوہ اپنی ماں سے کیا تھا۔ ماں نے جواب دیا، لڑکی! ادھر دیکھ! میں نے تجھے زندگی دی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ اب مشکل ہی سے تجھے اس سے زیادہ کچھ دے سکنے کے قابل ہو سکوں گی۔ لہذا شکوہ و شکایت تو چھوڑ اور اس زندگی کو کچھ بنانے کی فکر کر۔ یہ ایک مدبرانہ نصیحت تھی۔ خود پذیری ہمیشہ حقیقت پسندانہ خودداری کے ساتھ مگر تعلّی سے خالی ہونی چاہئے۔

## توہم بالذات

ایک طلسماتی اسکول جو اپنے طلبگاروں کو بھرپور شخصیت عطا کرنے کا مدعی ہے، پہلے ہی سبق میں ان کو ہدایت دیتا ہے کہ ایک قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود اپنا نام دہرائیں اور خوش آمدید کہیں، بار بار دہرائیں۔ اس طرح اپنے ذہن و دماغ کو خود اپنے آپ سے متاثر کریں۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ توہم بالذات کبھی زندگی کے سب سے زیادہ انتشار انگیز محرکات میں سے ایک بن جاتا ہے۔ ایک منضبط اور مرتب شخصیت کا وجود ممکن ہی نہیں جب تک کہ خود اپنی ذات کے باہر کچھ ایسی قابل قدر دلچسپیاں نہ پیدا کر لی جائیں کہ انسان اپنے آپ کو پوری طرح گم کر دے۔ امر کمال زندگی کے لئے اپنے آپ کو گم کر دینا ایک لازمی شرط ہے خود مرکزیت

بچپن میں تو بالکل فطری ہے لیکن بہت سے لوگ اس دائرہ کے باہر نہیں نکل سکتے، پچاس سال کی عمر میں بھی وہ کولھو کے بیل کی طرح اسی مخصوص دائرے میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح کی خود مرکزیت شخصیت کے ارتقاء کے لئے سم قاتل سے کم نہیں۔ اپنے آپ کو بھول جانے کے سلسلہ میں شعوری اور عملی ہدایات کا آغاز جسمانی سطح پر ہونا چاہئے۔ خود فکری کے ستائے ہوئے بکثرت افراد ماہر نفسیات کی خدمات کے بجائے عقلی دستور کے محتاج ہوتے ہیں۔ اگر عقل عمومی سے کام لے کر صحت مند زندگی کے خالص جسمانی تقاضوں اور شرطوں کو پورا کرکے وہ اپنے دکھ سے چھٹکارا پا سکتے ہیں۔

ہمارے ہم سخت قسم کی جسمانی مشغولیتوں کے لئے ایسی وہ شخص جو کسی ایسی دل پسند تفریح یا ورزش کا عادی ہے جس میں مشغول ہو کر وہ اپنے آپ کو بھول جا سکتا ہے بخوبی جانتا ہے کہ جذباتی نکھار اور ذہنی ترو تازگی کے لئے یہ نسخہ کیمیا سے کم نہیں۔ کام میں اپنے آپ کو گم کر دینا زندگی کی سب سے زیادہ پائدار لذتوں میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعصابی مریض کثرت کار کے بجائے زیادہ فرصت بے نہایت کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ نفسیات کے مشیر کا سابقہ ایسے لوگوں سے بکثرت پڑتا ہے جو خود فکری کے شکار ہوتے ہیں اور زندگی کی گم گشتہ مسرت کو اظہار خودی کی راہوں میں پا لینے کی خاطر زر کی طرح اصرار کرتے ہیں۔ ایک عامی کے نقطۂ نظر سے اظہار خودی یہ ہے کہ اپنے آپ کو آزاد چھوڑ دو۔ جذبات کے بیلوں کی ڈاٹ کو ایک ہی ضرب سے اڑا دو اور دبے ہوئے منجمد جذبات کی دھار کو قاتل کی آواز کے ساتھ خوشی سے رقص کرتے بہنے دو لیکن ہر دانشمند مشیر جانتا ہے کہ اظہار خودی کی مشق ٹھیک نفسیاتی حقائق کے مطابق ہو۔

جذباتی دعا کے اگر اس غرض سے وقوع پذیر ہوں کہ ایک لمحے کے لیے خودفکری یا سنسنی پیدا کر کے انفرادی لذت بہم پہنچا سکیں گے تو پھر ان کا سرے سے کوئی فائدہ نہیں اور اگر کبھی ہم اس طرح کی جذباتی تسکین یا انگار رونما ہو تو پھر زندگی انتشار و اضطراب بن جائے گی اور پہلے سے بھی زیادہ بے مقصد اور بے منزل ہو گی، مناسب اور موزوں طور پر اظہار خودی کا مسئلہ ایک نہایت نازک اور عمیق مسئلہ ہے، اظہار خودی کی صحیح تعبیر اور سچی تشریح و تعبیر آزاد مزاج یا دانشور لوگوں میں نہیں بلکہ کسی آرٹسٹ، سائنس داں یا پھر اس خوش نصیب ماں کی مشغولیتوں میں ڈھونڈنی چاہیے جو گھر کو گھر بنانے میں اپنے آپ کو گم کر دیتی ہے۔ کبھی یہ ان تجارت پیشہ لوگوں کی زندگیوں میں بھی مل جاتی ہے جو ذاتی منافع سے بڑھ کر سماج کے مفاد کی خاطر تگ و دو میں مصروف رہتے ہیں۔

ذات کی اس توسیع سے کم از کم دو عملی نتائج لازماً رونما ہوتے ہیں، پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ ایک سکون بخش قلبی کیفیت انسان اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے ہر وہ شخص جو غیر معتدل طور پر خودفکری کے آزار میں مبتلا ہو قلبی سکون سے محروم رہتا ہے اور اس کے لیے ایک ناگزیر سزا بن جاتی ہے۔

رابرٹ برنز (Robert Burns) کی دعا، "خدایا! ہمیں وہ قوت عطا ہو جس سے ہم اپنے آپ کو اس طرح دیکھیں جس طرح دوسرے ہم کو دیکھتے ہیں" صرف ان لوگوں کے حق میں قبول ہوتی ہے جو دوسروں کی زندگیوں کو اپنی زندگی بنا سکتے ہیں اور جن کی دلچسپیاں گہری اور وسیع ہوتی ہیں، وہ جو خودفکری کا مریض ہوتا ہے، اس کی دعا فطری طور پر کچھ اور ہوتی ہے، وہ تو یہی دعا کرتا ہے کہ "خدایا! اوروں کو وہ قوت عطا فرما جس سے وہ مجھے اسی نظر کی دیکھ سکیں جس سے میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں۔"

ایک مشہور کارٹونسٹ نے ایک تمام اپنے تمام شناساؤں کے کارٹون تیار کر ڈالے، نتیجہ ایک نہایت درجہ حیرت انگیز انکشاف تھا، ہر ایک نے تمام دوسرے ساتھیوں کے کارٹونوں کو پہچان لیے، لیکن بیشتر خود اپنے کارٹون نہ پہچان سکے۔ جس نظر سے ہم اور دوسرے دیکھتے ہیں اسی نظر سے خود اپنے کو دیکھنے کی صلاحیت کا فقدان خام خودمرکزیت کا ثبوت ہے۔

ارسطوفینز (Aristophanes) نے اپنے ڈرامہ بادل (The clouds) میں سقراط کی مضحکہ انگیز نقالی کی، ڈرامہ جب چل رہا تھا تو پورا تھیٹر لوٹ پوٹ ہو گیا، بیان کیا جاتا ہے کہ سقراط بھی ڈرامہ دیکھنے کے لیے گیا تھا اور جب اس کا کارٹون نظر پڑا تو وہ کھڑا ہو گیا تاکہ حاضرین اس کا ایک سے زیادہ بہتر طور پر لطف اٹھا سکیں، وہ ایک پختہ اور کامل و مکمل شخصیت کا مالک تھا اور اپنے کو اپنے آپ سے الگ کر کے بھی دیکھ سکتا تھا۔

"ذات" کی اس طرح کی توسیع کا دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مصائب برداشت کرنے کی قوت بڑھ جاتی ہے ایسے تمام لوگوں میں جو کڑے وقت سے نمٹنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور اس مقصد کے لیے اور اپنے سارے وسائل بروئے کار لاتے ہیں، ایک چیز مشترکہ طور پر ملتی ہے یہ کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کے بارے میں بھی سنجیدگی سے سوچتے رہتے ہیں۔

جذباتی شورشیں جو ہماری فطرت میں ودیعت ہیں، ان سب سے ہمیں بہرحال اچھا یا برا کام لینا ہے۔ جذباتی تقاضے مثلاً تجسس، غضبناکی، خوف، زندگی، خودداری، جنسی طلب، ہماری فطرت کے لازمی عناصر ہیں، ہم یا تو ذلت آمیز طور پر ان کے غلام بن جا سکتے ہیں۔

یا پھر ان پر قابو حاصل کر کے اپنی شخصیت کو زینت اور توانائی بخش سکتے ہیں۔ تجسس ایک بنیادی تقاضا ہے جو تمام نارمل انسانوں میں موجود ہوتا ہے اور متنوع صورت اختیار کرتا رہتا ہے۔

لوگوں کی کھڑکیوں میں جھانک لینے والے بچے، خاندانی گھریلو معاملات کی ٹوہ میں رہنے والے، خواہ مخواہ کی تفتیش فرمانے والے بوڑھے، اور وہ جو کنڈول سے سچائی کے جویا ہیں اور مختلف خطہ ہائے ملک کے حالات دریافت کرنے والے جاپانی ریسرچ سائنٹسٹ، سب کے سب شوقِ تجسس کی مثال پیش کرتے ہیں۔ تجسس کے کچھ طریقے ایسے بھی ہیں کہ آدمی کو نفرت و ملامت کا نشانہ بنا کر چھوڑتے ہیں اور بعض ایسے کہ آدمی ان کی بدولت لائق تحسین و آفرین قرار پاتا ہے۔ بہر حال اس شوقِ تجسس سے نمٹنا ضروری ہے۔ اسے نظر انداز کسی حال میں نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے تمام فطری تقاضوں اور امنگوں کے بارے میں یہ حقیقت یکساں طور پر صحیح اور درست ہے اور ان سے ہم کو کم از کم دو سبق اور بھی ملتے ہیں۔ اول یہ کہ فطرت انسانی کے جذباتی عناصر میں سے کوئی بھی قابلِ نفریں نہیں ہے اور ثانیاً یہ کہ صحیح طرز استعمال سے ہم ان میں سے ہر ایک کو انتہا پسندی اور عظمت بخش سکتے ہیں۔ جنگ جوئی ان جذبات میں سے ہے جن کی جڑیں فطرت انسانی میں بہت گہرائی تک اتری ہوئی ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ حیاتِ انسانی کے قیام اور ارتقاء کے لیے ایسا ہونا ضروری تھا۔ اسکا ظہور محنت و مشقت کے کاموں میں ذاتی کمزوریوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے میں، معاشرہ میں پھیلی ہوئی برائیوں کا قلع قمع کرنے کی کوششوں میں خوش گوار رنگ میں ہو سکتا ہے۔

دوسرا رخ بھی دیکھئے اگر ہم اس ناگزیر جذباتی امنگ کو بے لگام چھوڑ دیں تو نتیجہ سخت تباہ کن ہوگا۔ عزم، نفرت یا کسی کے خلاف کینہ، حسد کو نشوونما دینا خود اپنی ہستی کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیتا ہے۔ خفگی اور آزردگی کے شدید احساسات انسان کے جسم میں بیماری کے جراثیم کے مانند طرح طرح کے عوارض کی نشوونما کرتے رہتے ہیں۔ اگر بدقسمتی سے آپ نے کسی کو اپنا دشمن بنایا ہے تو سب سے تباہ کن اثر آپ کے دشمن پر نہیں بلکہ خود آپ پر پڑ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ آزردگی اور خفگی کو پوری طرح بیٹھ جانے کا موقع دینا اور نفرت کی مخالف کے حق میں عزم اور مستقل بن جانے۔

انسانی مزاج کا ایک اور ناگزیر عنصر خوف ہے۔ اسکی سادہ ترین شکلوں کو بھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کسی بڑے شہر کی سڑکوں پر بھی ایک صحت مند خوف ہے جو موٹر کے ٹھیک ٹھیک معنی مراد ہے آدمی چھپ کر رات ہوئے پیچھے سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ خوف زبردست تخلیقی قوت کا حامل بھی ہو سکتا ہے۔

بڑی حد تک ہمارے اسکول بے علمی اور جہالت کے خوف کی پیداوار ہیں۔ اور صنعتوں کی ترقی کا دارومدار افلاس کے خوف پر ہے۔ بیماریوں کا خوف میڈیکل سائنس کی ترقی کا ذمہ دار ہے۔ لیکن غیر معتدل قسم کے خوف، ہسٹریا، فوبیا، وہمی پریشانیاں شخصیت کے ٹکڑے اڑا دیتی ہیں۔ طرح طرح کے نامعلوم خوف انسانی فطرت پر گرفت رکھتے ہیں مثلاً اندھیرے کا خوف، بلیوں کا خوف، بند جگہوں کا خوف، کھلی جگہوں کا خوف، ذمہ داری کا خوف، بچوں کی کثرت کا خوف، بڑھاپے کا خوف، موت کا خوف، جرم کا خوف، گزشتہ گناہوں کا خوف اور سب سے بڑھ کر یہ کہ افسر و بالا دست کا خوف۔ ان کے علاوہ تمام خوف، ان کے سوا ایک مبہم اور ناقابلِ فہم خوف بھی ہے جو بعض لوگوں کے معاملے میں بڑھتے بڑھتے اتنا بڑھ جاتا ہے کہ پوری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لیکر انسان کو لعنت زدہ بنا کر چھوڑتا ہے۔ خوف کو روشنی میں لاکر دیکھنا اور اسکا مقابلہ کرنا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ بچوں کو صرف دو چیزوں سے خوف ہوتا ہے۔ گرنا یا زبردست شور ہنگامہ۔ دوسرے تمام خوف ان دونوں کے بعد آتے ہیں۔ یہ معلوم کرنا کہ انکی ابتدا کہاں اور کیسے ہوئی، کس طرح یہ بڑھتے اور پھیلتے ہیں

غرض خوف پر اس طرح نظر ڈالنا ہوگا کہ وہ ہمارے لیے نہیں بلکہ کسی اور کے لیے ہیں اگر ہم تعاقب کر سکیں تو اگر ہم ڈھیلی روانی تو نہیں جیت لیتے ہیں اس کے بعد خوف کو توجیہوں میں ڈھالا جا سکتا ہے

کبھی کبھی جس قسم کے خوف سے ہمارا سامنا ہوتا ہے وہ سراسر معقول اور صحیح ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر بکثرت لوگ اس مغالطے سے دھوکہ کھا جاتے ہیں کہ پُرخطر صورت حال بہر طور ناپسندیدہ ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ یہ خطرات اپنے اندر تحریکیت کا ایک پہلو رکھتے ہیں۔

انسان کے قوی ترین محرکات میں مختلف محبت کرنا بھی ہے۔ جب زندگی خطرات سے یکسر خالی نظر آتی ہے تو انسان خطرات کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ مثلاً اسپورٹس، پُرخطر تحقیقات اور دریافت اور پُرخطر مہمات اسی بنا پر۔ کبھی آدمی یکسر بیہودہ یا غیر تحریکیا مقاصد کی حمایت اور سرپرستی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ خطرناک صورت حال کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا اور خطرہ کو خطرہ کے بجائے جنگ سے محبت کا نام دینا قطعی طور پر اولوالعزمی اور صحت مندی کا ثبوت دینا ہے۔

## مقصدِ حیات

مقصد یا غیر صحت مند خوف کا ایک علاج کام میں مشغولیت ہے۔ ایک ماں کی روزمرہ زندگی کی کہانی اس مطلب کی بخوبی وضاحت کرتی ہے "ایک نئی نویلی گھر والی کی حیثیت سے مجھے طرح طرح کے خوف لاحق تھے۔ انہیں ایک یہ بھی تھا کہ میں کہیں پاگل نہ ہو جاؤں۔ ہمارے پہلے بچہ کی ولادت کے بعد بھی یہ سارے خوف باقی تھے۔ کچھ ہی عرصہ بعد ایک اور بچہ پیدا ہوا۔ کل چھ بچوں پر جا کر یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ ہمارے پاس کبھی کچھ زیادہ رقم نہیں تھی اور اس لئے مجھے سبھی کام کرنے پڑتے تھے۔ جب کبھی مجھے اپنے بارے میں کوئی خوف ستانے لگتا، کہیں کوئی بچہ رونا شروع کر دیتا اور میں دوڑ کر اسے چپ کرانے میں لگ جاتی یا ایسا ہوتا کہ بچے آپس میں لڑ جاتے اور میرے لیے انکا جھگڑا چکانا ضروری ہوتا یا اچانک یاد آ جاتا کہ کھانا پکانے میں دیر ہو رہی ہے یا یہ کہ دھلے ہوئے کپڑے جو باہر سوکھ رہے ہیں بارش آنے سے پہلے اتار کر اندر رکھ دینا چاہئے یا ان پر استری کرنا شروع کر دینا چاہئے۔ اس طرح میرے خوف کے تسلسل میں برابر میری مشغولیتیں خلل انداز ہوتی رہیں اور بالآخر وہ سب بتدریج ایک ایک کر کے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے اور اب حال یہ ہے کہ ان کے بارے میں کبھی سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔"

خوف کی دوسری خاصیتیں اچھی اور بری کا بیک وقت مظہر ہوتی ہیں۔ اس حقیقت کو آپ اس شخص کی مثال سے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جو اپنے کام کے انجام میں پیچھے رہ جانے سے ہمیشہ خائف رہتا ہے کہ اور زندگی فرض کی محنتوں اور مشقتوں کا خوف اسکے دل سے تقریباً نکل سا جاتا ہے۔ کام کی بات تو یہ ہے کہ آدمی اپنی جدوجہد کا کوئی مقصد متعین کرے وہ خواہ ایک بچہ کی پرورش اور اسکی تربیت کا ہی ہو یا روزانہ کے کام کی مقدار ہو یا پھر بلند ترین سطح پر دنیا کو جنگ کے خوف سے نجات دلانے کا مقصد ہو۔ غرض یہ ہے کہ تعین کے ساتھ زندگی کا کوئی مثبت مقصد ہمیشہ پیش نظر رہے۔

## فکرِ ذات

عزت نفس اور خودداری نفرت کے قابل یا دبانے والی چیزیں نہیں بلکہ شستہ اور شائستہ تر بنا کر فخر سے اٹھانے کی چیزیں ہیں۔ چارلس لیمب نے کہا ہے کہ میری دانست میں سب سے بڑی مسرت یہ ہے کہ آدمی کوئی نیکی خفیہ طور پر انجام دے اور بالکل اتفاق سے وہ لوگوں پر عیاں ہو جائے۔ یہ مقولہ اس حقیقت کی پردہ کشائی کر رہا ہے کہ عزت نفس میں اضافہ کرنے والے التفات کی خواہش کس طرح ہمارے رگ و ریشہ میں پیوست ہوتی ہے۔

کم چھچھورے اور خشک مزاج لوگوں کا اصرار ہے کہ بلا امتیاز اغراض سے پاک زندگی کا مدار بالکلیہ فکرِ ذات پر ہوتا ہے۔ بہر

قول میں کچھ صداقت ضرور ہوتی ہے لیکن تکلفات سے اپنی حضرات کی بیزاری بالکل غلط ہے۔ ہم میں سے ہر ایک بچے کی حیثیت سے جب زندگی کی ابتدا کرتا ہے تو اسکی ساری جبلتیں

انکی ذات ہی کے محور پر گردش کرتی ہیں۔ لیکن ذاتی عظمت و سربلندی کا راز ان غیر ذاتی یعنی خارجی مقاصد حیات میں ڈھونڈنا چاہیے جنکے حصول کیلیے ہم اپنی جان تو کیا اور توانائیاں وقف کر دیتے ہیں اور جنکے لیے ہم سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں

ایک دانشمند نفسیاتی مشیر کے

کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ذاتی اہمیت کا احساس کوئی ناپسندیدہ شے ہے، بلکہ اس کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس اور خواہش کو مفید تر تعمیری کاموں میں لگا دے۔ ہم تکلفات سے بے نیاز نہیں ہو سکتے اور نہ ہمارے لیے ایسا کرنا مناسب ہے زندگی میں ہم سب کا فرض یہی ہے کہ ہم ذات کی کچھ اس طرح کی اور ایسی فکر کریں کہ وسیع تر معنوں میں اسے کوئی کام کی چیز بنا دیں۔ غالباً جنسی دائرے میں یہ بات کچھ زیادہ کہی جاتی ہے کہ ہمیں ان تقاضوں کو زیادہ شائستہ اور شریفانہ اور اخلاقی سطح تک مرتفع کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ باتیں تو اس طرح کی سبھی کرتے ہیں لیکن حقیقت تک رسائی کم ہی لوگوں کی ہوتی ہے واقعہ یہ ہے کہ بہت سے جسمانی تقاضے ایسے ہیں کہ انہیں ان کی سطح سے اٹھا کر بلند تر سطح تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔ مثال کے طور پر اگر بھوک لگی ہو تو بس کھانے ہی سے تسکین ہو سکتی ہے کوئی اور شے کھانے کی جگہ نہیں لے سکتی۔ جنس کے مسئلہ پر اگر اسکے محدود معنوں کے اعتبار سے غور کریں تو وہ بالکل بھوک کے مانند ہے۔

ہم اس نوجوان سے جسے اس فطری حیاتیاتی تقاضے نے پریشان کر رکھا ہے بہت سی معقول باتیں کہہ سکتے ہیں مثلاً یہ کہ تجرد کسی ناتوانی یا اضمحلال کا سبب نہیں ہوا کرتا۔ جنسی تقاضا برا نہیں لیکن صحت کیلیے جنسی عمل ضروری نہیں بغیر آسودہ جنسی طلب سے پیدا شدہ اضطرابات کا دفعیہ با مشقت کاموں کی مشغولیت

کلی طور پر کر دیتا ہے یہ اس لیے کہ سارا جسم سخت مشقت کی بنا پر تھک کر چور ہو جاتا ہے۔ جنسی طلب سر تا سر معقول اور قطعاً فطری ہے۔ اور اس لائق ہے کہ ہم اسے بنظر استحسان دیکھیں۔ اور اپنی جسمانی ساخت کے لوازمات میں شمار کر کے خوش دلی سے اسے خوش آمدید کہیں۔ یہ تو دبیز کرمی احساس جرم کو راہ دے کر فطرت کی اس دین کے نام کو بٹہ لگائیں یہ کہ فطرت کو اگر ہم اسکے حال پر چھوڑ دیں تو جنسی طلب کی تسکین کا سامان وہ از خود پیدا کر لیتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ

جنسیات کا مسئلہ سرسری طور پر جیسا کچھ دکھائی دیتا ہے حقیقت کے اعتبار سے اس کی جڑیں اس سے کہیں زیادہ گہرائی میں فطرت انسانی کے اندر اتری ہوتی ہیں اور ہماری شخصیت کے سارے تار و پود کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں۔ خاندان کے سارے رشتے خواہ وہ مادر اور پدری محبت کے ہوں یا بشرانہ اور خواہرانہ حیثیت کے سب کے سب جنسیات کے اسی وسیع تر مفہوم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح دوستی اور محبت کے تمام لطیف احساسات جو بھائیوں اور بہنوں میں پائے جاتے ہیں یا غیر مردوں اور عورتوں سے ہی کس پیدا کر لیے جاتے ہیں غرض یہ کہ محبت و یگانگت کے سب صورتیں کی ساری تاثیرات مختلف ہو کر کبھی پورے سماج کو آغوش میں لے لیتی ہیں اور جنکی ابتدا گھر کے ماحول میں ہوئی تھی اپنے وجود ذات نشو و نما اور وسعت کے اسی جذبہ جنس کی مرہون منت ہوتی ہیں۔ مجموعی طور پر جب زندگی کو اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے جذبہ جنسی کی پاکیزگی اور بہت معمولی چیز بن جاتی ہے۔ آدمی کیلیے ایک ایسے طرز زندگی کا انتخاب ممکن ہے جو اسکی جذباتی اور تخلیقی قوتوں کو ایسی سکون بخش راہوں پر لگا دے جن سے شخصیت کو بحیثیت مجموعی چین نصیب ہو۔ اگرچہ مخصوص جذبہ جنسی کی آسودگی کا سر و سامان بالکل نہ ہو۔

ایک غیر شادی شدہ عظمت اور ہی سے محروم خاتون درسگاہ تعلیم و تدریس یا خدمت خلق کے مشغلوں میں مشقت مادرانہ اور اسکے جبلی تقاضوں کی تسکین کے ذریعہ اپنی شخصیت

میں یکسانگی اور یکسوئی کی آسودگی حاصل کر سکتی ہے۔ یہ حقیقت ہر شخص کو تسلیم ہے کہ ہمارے جبلی تقاضوں کو کھلی چھوٹ نہیں ملنی چاہیئے ورنہ یہ بندھن انسان پر حاوی ہو جائیں گے۔ ایک ایسی زندگی کا تصور کیجئے جس کے سارے جنسی تقاضے ایک ساتھ ابھر اٹھتے ہیں یعنی خود نگری، تعلّی ذات، جنگجوئی، جنسی طلب غرض سب اپنی اپنی تسکین کیلئے زور لگاتے ہیں۔ نتیجہ ایک طوفان بدتمیزی کے سوا کیا نکل سکتا ہے؟ یہ جو ایک عام خیال پھیلا ہوا ہے بنیادی جذباتی تقاضوں پر پابندی لگانا بغیر سمجھے ایک طرز عمل ہے تو یہ سراسر بے بنیاد ہے۔ فی الحقیقت یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ فطری تقاضوں اور رجحانات پر پابندی لگانا چاہیئے یا نہیں۔ اصل مسئلہ صرف یہ ہے کہ ضبط و پابندی کی کونسی شکلیں بہترین اور مفید ترین ہونگی۔

فطری تقاضوں کے صحیح اور غلط استعمال کے بے شمار امکانات ہماری صفت حساسیت میں پنہاں ہوتے ہیں جو تمام انسانی جذبات کی ایک مشترکہ صفت ہے۔ احتساب ذات کا پہلا عنوان یہی ہے کہ ہم تحقیق کریں کہ اس اہم خصوصیت کا استعمال کس طرح کرتے ہیں۔ اگر آدمی صحیح طور پر دریافت کر سکے کہ کن امور کے بارے میں بیجا وہ ضرورت سے زیادہ زود حس واقع ہوا ہے تو محض یہ بات ذاتی مسائل کے سلجھاؤ کے لیے اسکے اندر بڑی بصیرت پیدا کر دیگی۔ بعض لوگ تنقید کے باب میں بیحد زود حس ہوتے ہیں دوسروں کی رائے کا لحاظ اور احترام کے بغیر سماجی زندگی کا وجود ممکن نہیں۔ ایسے لوگوں کے اندر اپنی حقیقت کو کھو کر ایک بیماری بن گئی ہے۔ اعتدال سے ہٹے ہوئے یہ لوگ تحسین و آفرین کو تو اپنے حق میں لازمی سمجھتے ہیں اور تنقید کو بے تمیزی خیال کرتے ہیں۔ اعتدال پسند آدمی کا معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ اسکا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر حال میں تنقید کو لازمی سمجھتا ہے البتہ تحسین و قبول کو اوکس خیالی بیماری

انتشار ذات کے عام اسباب میں سے ایک سبب یاس بھی ہے۔ بعض مایوسیاں مادی اسباب کی بنا پر ظاہر ہوتی ہیں۔ لیکن وہ مایوسیاں جو خالص ذہنی ہوتی ہیں، انتشار طبع کے طور پر کبھی کبھی انسان پر طاری ہو جایا کرتی ہیں جو ہمارے دائرہ اختیار سے باہر ہرگز نہیں ہیں۔ اس مشکل کو سلجھانے کے سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یاس و ناامیدی کے دورے کو ناگزیر سمجھ لیا جائے۔ ہر شخص پر یہ کیفیت کبھی نہ کبھی درجہ میں طاری ہوتی رہا کرتی ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ یہ ہماری کبھی بھی نہ پھٹکنے پائیں تو یہ قطعاً ایک ناممکن امر ہے۔ اس صفت یاس کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینا اسے مسلسل پیش نظر رکھ کے مواقع فراہم کرنے کے مترادف ہے جو ہمارے تعاون کے بغیر حاصل ہو ہی نہیں سکتے۔ ایک دوسرا مشورہ روزانہ کے طرز عمل کے لحاظ سے اہم ہے۔ ہم اپنی شخصیت کی حقیقی تصویر پسندیدہ طبعی احوال و کیفیات پر دیکھیں نہ کہ غیر پسندیدہ احوال و معاملات میں۔ ہم سب کے اندر بہت گہرائی میں ہی مگر ہر حال یہ خصوصیت موجود ہوتی ہے۔

ذات یا انا میں قوت موجود ہے کہ ایک کیفیت کو مسترد کر کے دوسری کیفیات یا احوال کو اپنا صحیح ترجمان قرار دے مایوسی اور کبیدگی کے بجائے خیرسگالی اور رجائیت کے نتائج میں اپنے آپ کو ڈھال لے۔ افسردگی اور دل شکستگی کے اثر میں ایک سا چیز بطور قدر مشترک کے پائی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اپنی یہ عادت بنا لیتے ہیں کہ خود کو اور مایوسی کو لازم و ملزوم یقین کرنے لگتے ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ انکے جذبات کی دنیا میں بہت سے تہ خانے ہوتے ہیں جیسے کہ اداروں کے یہاں بھی ہوتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ساری زندگی انھیں تہ خانوں میں بسے بستے ہیں۔ وہ انھیں ان سے باہر نکلنا نصیب نہیں ہوتا۔ افسردگی کا شکار ہم سب کبھی نہ کبھی ہوا کرتے ہیں لیکن افسردہ اور دل شکستہ ہونا کچھ ضروری نہیں۔

یہیں سے ایک تیسری بات نکلتی ہے جب دل شکستگی طاری ہو تو صرف حالات ہی کو الزام نہ دے کر ختم ہو جاؤ۔ اپنے آپ کو بھی ٹٹولو اور خود کو سلجھانے کی کوشش کرو۔ حالات واقعی کبھی ایسے دردناک اور دل شکن ہوتے ہیں کہ افسردگی ناگزیر ہو جاتی ہے تاہم ایسا نہیں ہے کہ بدقسمتی سے سانحہ کے بعد کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ اسے افسردگی اور دل شکستگی کا حق حاصل ہو گیا۔ ایسا سمجھنا سب سے زیادہ بھیانک غلطی ہوگی۔

زندگی ہر جذب و انجذاب کا عمل برابر جاری رہتا ہے جو کچھ ہمارے اندر داخل ہوتا ہے اسے بدل کر ہم اپنی ذاتی صفات میں تحلیل کر لیتے ہیں۔ والٹر ڈی لامیر کی نظم اس لحاظ سے بڑی وسیع معنویت کی حامل ہے۔

یہ ایک نہایت عجیب بات ہے
اتنی عجیب جتنی کہ ممکن ہے
مس ٹی جو کچھ بھی کھاتی ہے
وہ سب بالآخر مس ٹی ہو
جاتی ہے۔

چوتھی تدبیر ذہنی سلجھاؤ اور تسکین سے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بتاتی ہے کہ دوسروں کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ جذبات ہمیشہ متعدی ہوتے ہیں۔ ایک افسردہ دل پورے خاندان کو افسردہ اور دل شکستہ بنا سکتا ہے۔ بلکہ اجنبیوں تک کیلئے آفت بن جاتا ہے۔ یا پھیلاؤ شعور [illegible] کی گھر کے گوشوں میں چھپے ہوئے [illegible] کو اچھال لیتا ہے۔ یاد رکھو بعض فرائض ایسے ہیں کہ تم افسردہ اور دل شکستہ ہو یا نہ ہو ہر صورت انہیں انجام دینا ہے۔ قوی شخصیتیں اس [illegible] کے مسئلے کو یکسر نظر انداز کر کے نہیں بلکہ ان سے پہلو بچاتے ہوئے چل کر طے کرتی ہیں۔ انکے سامنے ایک کام ہوتا ہے ایک مقصد ہوتا ہے جسے حاصل کرنا ہے۔ اب وہ چاہے غمزدہ اور دل شکستہ ہوں یا نہ ہوں وہ اپنا سارا زور اور اپنے پورے وجود کو اسی ایک مقصد کی سمت موڑ دیتے ہیں۔

شخصیت کے اطراف و جوانب کو ایک نقطہ پر مجتمع کرنے کیلئے داخلی قوتوں کے خزانے درکار ہوتے ہیں۔ یہ ہیں اگرچہ داخلی قوتیں مگر حاصل خارج ہی سے کی گئی ہیں۔ درخت جس طرح اپنا وجود اس کیمیاوی جذب و انجذاب کی بدولت باقی رکھتا ہے جو جڑوں اور پتوں کے ذریعہ رونما ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح ہمارا جسمانی وجود بھی خارج سے تصرف میں لائی ہوئی قوتوں سے اپنے آپ کو برقرار رکھتا ہے۔ یہ ساری کائنات وہ تمام ناگزیر وسائل بہم پہنچانے میں مصروف رہتی ہے جن کے سہارے ہم زندگی کو باقی اور قائم رکھ سکتے ہیں۔ ہم انرجی کے ایک خزانہ بے نہایت سے بطور پنشنر کے اپنا حصہ پاتے ہیں۔ قوت ہمارے اندر رہتی ہے اور نہ بنائی جاتی ہے بلکہ ہمارے وسائل سے وہ گویا واگذاشت کی جاتی ہے۔ یہ قوت کی واگذاشت کا اصول انسان کے جسمانی یا نفسی تجربہ کو چلانے والی کسی خارجی حد فاصل پر جا کر ختم نہیں ہو جاتا تمام قابل قدر مذہبی تجربات کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ہمارے نفوس ایک زبردست روحانی سرچشمہ حیات سے زندگی پاتے ہیں اور اسی کی بدولت انہیں برقرار بھی رکھتے ہیں۔

اور اس عالم میں بھی قوت ہماری اپنی پیدا کی ہوئی نہیں ہوتی بلکہ ہم تو اسے جذب کرنے والے ہوتے ہیں۔ نفسیاتی مشیر کے سامنے آنے والے مسائل میں سب سے زیادہ درد انگیز مسئلہ اس شخص کا ہوتا ہے جس کا تمام تر بھروسہ اور سہارا اپنے مشکلات کے حل کرنے کے سلسلے میں صرف اپنی قوت ارادی پر ہوتا ہے۔ جلد یا بدیر اسکا سابقہ ایسے مسائل سے پڑ کے رہتا ہے جہاں اس کی یہ تکنیک یکسر ناکام ثابت ہوتی ہے مثلاً موت کی جدائی کے بے اندازہ غم کی حامل ہوتی ہے۔ علاوہ اسکے غم کے لیے مذہبی عقیدوں کا سہارا ڈھونڈتی ہے۔

بہت سے لوگ سوال کرتے ہیں مذہبی عقیدہ کیسے حاصل

کیا جائے گا۔ آدمی کے چاہنے پر اسکے حصول کا دارومدار نہیں
ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ وہ ہر شکل میں پہلے سے موجود ہوتا ہے
بلکہ انسان کے ضمیر میں گندھا ہوا ہوتا ہے۔ ایسا محسوس
ہوتا ہے کہ ضرورت سے کچھ زائد مقدار میں ہم سب کو عطا
کی جاتی ہے جسکا استعمال بعض اوقات لوگ بالکل غلط
موقع محل پر کر بیٹھتے ہیں۔ بے محل استعمالات اتنے بیشمار
ہیں کہ زبان انکو گننے اور بتانے سے عاجز ہے۔ مثال کے
طور پر رکھنے والے کچھ لوگ شب پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ جوتش اور علم
نجوم پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ خرگوش کے پیروں کی برکت پر
یقین رکھتے ہیں۔ ہر غلط صحیح اقتصادی بہبود کے نسخوں کے تیر
بہدف ہونے پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ یہ جو لوگ ہر گری پڑی
اور بعض اوقات مضحکہ خیز اور ہولناک چیزوں پر عقیدہ
باندھ لیتے ہیں۔ ظاہر کرتا ہے کہ آدمی وافر مقدار میں یہ جذبہ
رکھتا ہی ہے کہ بعض اوقات لوگ بے سوچے سمجھے مثل مشہور
کی طرح دونوں ہاتھوں سے اسے لٹانا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم
اکثر اپنی گفتگو میں یقین اور بے یقینی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں
یہ محض لفظوں کے کھیل یا کرتب ہیں اور حقیقت پر پردہ ڈال
دیتے ہیں۔ کوئی بھی یقین سے خالی نہیں ہو سکتا۔ بے یقینی مگر
سے کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ ہر شخص نفسیاتی طور پر پابند
ہے کہ عقیدہ رکھے خدا پر یا غیر اللہ پر۔

مثبت عقیدہ جب ختم ہوتا ہے تو لازماً کوئی منفی
عقیدہ اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ممکن
کے بجائے ناممکن پر یقین کرنے لگتا ہے۔ ایسی باتوں پر
یقین کرنے لگتا ہے جو اسے زندگی کا مالک نہیں بلکہ زندگی
کا غلام بنا دیتی ہیں۔ ایسے فلسفوں پر فریفتہ ہو جاتا ہے جو
اس پر تزلزل اور اضطراب مسلط کر دیتے ہیں اور مایوسی طاری کر
دیتے ہیں۔ پیدائش سے لیکر زندگی کا شوق سب ختم ہو جاتا ہے۔
ایک دوست نے ایک مرتبہ توجیت سے
کہا تھا میرے نزدیک اپنے آپ کو ہمیشہ

دوم درجے میں رکھنے پر رضامند کر لینے ہی میں زندگی کی ساری
اہمیت پوشیدہ ہے۔ توجیت نے جواب دیا "میرے
نزدیک زندگی کا کل مسئلہ صرف اس قدر ہے کہ ہم اپنے لئے
اولین جگہ کس چیز کو دیں۔ اس طرح آدمی جس چیز کو اولین مقام
دیتا ہے وہی اس کی عقیدت کا مرکز بن جاتی ہے، اسی پر اسکا
یقین جم جاتا ہے اور وہ خود اسی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس باب میں
بڑی غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ کبھی آدمی کسی پیشے کو یا دوست کو یہ
مقام دے دیتا ہے مگر ہوتا یہ ہے کہ ایک مرتبہ جب سوچ سمجھ کر
یہ فیصلہ کر لیا جاتا ہے تو مرتے دم تک عمل در آمد کی تلافی پڑتی ہے۔
زندگی کے تیسرے نقطہ نظر سے ذات کا انفرادی استحکام یا
انتشار یا انکار منحصر ہے کسی عقیدے کی موجودگی پر۔ ہم اس
افسردہ دل اور سودائی قسم کے لوگ اکثر یہ سوال کرتے
ہیں کہ آخر ایک مرتب اور با ثبات شخصیت کی تشکیل کے چکر
میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے، آخر ہماری اہمیت ہی کیا
ہے؟ یہ ستم زدہ لوگ دنیا میں کوئی چیز بھی منتہائے حیات
بنانے کے قابل نہیں پاتے۔ ان کے پاس انگیز نظر کے علاوہ
ایک منفیت عقیدہ ہی بن سکتا ہے۔ رابرٹ لوئیس سٹیونسن
نے کہا ہے "میں یقین رکھتا ہوں کہ ہر شے کی انتہا اور انجام حسن و خوبی
پر ہوگا۔" یہ عقیدہ بھی بے حد قابل قدر ہے اگر اسٹیونسن کے اعتراف
کے آگے بڑھ کے دیا جائے کہ مذہبی عقیدہ انسانی زندگی کا تمام تجربہ
میں توانا ترین محرک ہے۔ مذہب تو پکار کر کہتا ہے اور ہر ہر
انسان سے کہتا ہے کہ تم زندگی کی دوڑ اور راہوں میں ناکام ہو سکتے
ہو مگر ایک حقیقی شخصیت کے ارتقا کی کوشش میں کبھی
ناکام نہیں ہو سکتے۔ عظیم شخصیتیں حالات کے سلسلہ میں بہتیری
کمزوریوں، کوتاہیوں، مصائب اور کبھی اتفاق نا گہانی
سے سابقہ پڑتا ہے مگر عقیدہ وہ چیز ہے کہ انکو جہاد اور عظمت
کے سانچے میں ڈھال کر رکھ دیتا ہے۔ یہ کائنات بے مقصد
اتفاقی ذرات کا کوئی الل ٹپ ڈھیر نہیں ہے بلکہ اس کی اولین
تنظیم اس کی روحانی اقدار، روحانی احوال کارفرما ہیں اور انسانی شخصیت

کسی قبول کے نتیجہ میں وقوع پذیر نہیں ہوئی بلکہ روئے زمین پر حیات کی یہ سب سے کامل اور حسین جلوہ گری ہے اور رہا بلیغ انداز میں ذات خداوندی کی طرف اشارہ کر رہی ہے

اس طور سے مذہب پر امید سرگرمیوں کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اور ممکن الحصول قوتوں کا سرچشمہ بن کر انہیں اپنی فطری صلاحیتوں سے بیش از بیش کام کرنے کیلئے موقع عطا کرتا ہے۔ اور جہاں وہ کچھ بنانے میں مدد دیتا ہے جو حقیقت کے اعتبار سے ہم کو بننا چاہیے۔ اور جو کوئی تعمیر ذات یا تکمیل خودی کی ذمہ داری قبول کرتا ہے وہ کائنات کے مقصود حقیقی تک پہونچنے والی شاہراہ پر گامزن ہو کر اس مرکز کائنات، آرزوئے حیات یعنی خلاق و عالم و عالمیان سے برابر قریب سے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔

---

## حیاتِ نو

نعمت دین و ایماں نوع انسانی نے پائی ہے
کلام پاک کی، قول نبیؐ کی رہنمائی ہے
حقیقت ہے کہ اس لادینیت کے دور میں یارو
حیات نو، بلریا گنج اعظم گڈھ سے آئی ہے
(نادان بستوی)

---

## جامعۃ الفلاح

ہے دعا یہ جامعہ گوہر فشاں بنتا رہے
تشنہ لب کے حق میں بحر بیکراں بنتا رہے
یا الٰہی حشر تک یہ دین کا روشن چراغ
آفتاب و ماہتاب و کہکشاں بنتا رہے
نادان بستوی

---

# جس نے روشن کر دیئے ایوانِ ظلمت میں چراغ

راشد حامدی
(متعلم جامعۃ الفلاح)

اللہ اللہ کدھر گیا دنیا سے وہ عالی دماغ
جس کی تحریروں میں تھا گم کردہ منزل کا سراغ
جس کا ہر نقش قدم قرآن کی تفسیر تھا
جس نے روشن کر دیئے ایوانِ ظلمت میں چراغ

جس نے مسلم نوجواں کو درس خودداری دیا
خواب غفلت سے جگایا درس بیداری دیا
آج جس کی کوششوں سے عالم اسلام میں
ہر طرف برپا ہے تحریک نظام مصطفےٰ

جس نے ملت پر کئے اسرار ہستی آشکار
درد میں ملت کی رہتا تھا جو ہر دم بیقرار
ظلمتوں سے عمر بھر جو برسر پیکار تھا
واقعی وہ مرد حق تھا حق شناس حق شعار

ظلمتِ الحاد سے جو عمر بھر لڑتا رہا
آہ! وہ مرد جواں زیر زمیں روپوش ہے
جس کی کرنوں سے ہوئی ظلمت کدہ میں روشنی
اللہ اللہ آج وہ مہر مبیں روپوش ہے

---

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیں
(منیجر)

شبنم سبحانی

# یہ پانچ لاشیں

ایمرجنسی کے پرہول دور میں ستمبر ۱۹۷۶ء میں شہر سلطان پور سے ۱۵ کلو میٹر کی دوری پر انگیڈیہ کے مقام پر جبری نس بندی کے خلاف احتجاج کرنے کی پاداش میں ایک مجمع پر وحشیانہ فائرنگ کی گئی تھی، اس فائرنگ میں اگلی صفوں میں اسی بستی کے وہ جرات مند مسلم نوجوان تھے جو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے میں اپنے ملی وقار کے لئے سر سے کفن باندھ کر آئے تھے اور بہادری کے ساتھ انہوں نے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ واقعہ کے تین دن بعد ان پانچ جیالوں کی لاشیں پولیس کے غیر معمولی پہرے میں شہر کے مسلم رہنماؤں کے حوالے کی گئیں کہ انہیں خاموشی کے ساتھ سپردِ خاک کر دیا جائے، ان مدفنین میں راقم الحروف بھی شریک تھا اس پرہول منظر کی ایک جھلک اس نظم میں اسی وقت قلمبند کر لی گئی تھی، مدیر "حیات نو" کے پیہم اصرار پر اسے اشاعت کے لئے ارسال کر رہا ہوں تاکہ میرے احساسات میں قارئین حیات نو بھی شریک ہو سکیں۔

یہ پانچ لاشیں
عجیب ادائے عجیب شوکت سے بانکپن سے
چلی ہیں مقتل سے مقبرے کو
محافظوں نے سنگینوں کو ان کے تعین بنا دیا ہے۔
دبی اٹھیں گور کس مپرساں کی سمت لے کر
رواں دواں ہیں
وہ آتشیں اسلحے علم ہو گئے ہیں ان پر
کہ جن کے شعلوں نے خرمنِ زندگی کو ان کے
جلا دیا ہے
مگر یہ جل کر تو اور بھی ہو گئے فروزاں
یہ پانچ لاشیں ہیں
ان جیالوں کی
جو چٹانوں سے جا کے ٹکرا گئے ہیں یارو!
محافظوں نے دہلیز پہ ستم کی

نہ سر جھکایا، نہ خوف کھایا
فقط اسی جرم کی سزا میں
اسی عہد جمہوریت کے چنگیز
ان کو جینے کے حق سے محروم کر چکے ہیں
مگر یہ مر کر تو بیکراں ہو گئے ہیں یارو!
عجیب عالم، عجیب اداسی عجیب خموشی
محیط ہے گور کس مپرساں کے چار جانب
سیاہ ہوا کے مہیب جھونکوں کی چاپ سے کچھ
سکوت کا تار ٹوٹتا ہے
ہلاکو وقت کے کریہہ گھوڑوں کی ہنہناہٹ
فضاؤں پر برق لیے اماں بن کے گرج رہی ہے
کسی بھی لب پر فغاں نہیں ہے
نہیں کسی کو یہاں پہ اذن کلام یارو!

یہ کس نرالی ادا سے تدفین ہو رہی ہے
یہاں زیادہ ہیں اقربا سے
سپاہ قانون کے محافظ
انھیں یہ اندیشہ ہے مبادا
یہ پانچ لاشیں نہ کروٹیں لے کے اٹھ کھڑی ہوں
یہ سوئے طوفاں نہ جاگ اٹھیں

---

عجیب دل دوز ہے یہ منظر
وہ ایک گوشہ میں جو حوا کی بیٹیاں ہیں
نہ جانے کس طرح آ گئی ہیں
اداس و افسردہ سی کھڑی ہیں
دبی ہوئی سسکیاں لبوں پہ
اٹک گئی ہیں خموشی چیخیں گلے کے اندر
بھینچے ہوئے ہونٹ پر ہیں پھر تھرتھری آہیں
عجیب باتیں
فسردہ دل بہنیں، شکستہ دل بیٹیاں خلاؤں میں گھورتی ہیں
خدا سے انصاف مانگتی ہیں
نگاہ پر آنسوؤں کی چلمن پڑی ہوئی ہے
زباں تو خاموش ہے مگر ان کی بے زبانی یہ کہہ رہی ہے
کہ خون ناحق کبھی نہیں رائگاں ہوا ہے ۔

---

# مفکر اسلام مولانا مودودی کے انتقال پر

# آزاد ہند کلکتہ کا اداریہ

جماعت اسلامی کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ۲۲ ستمبر کو نیویارک میں انتقال کر گئے ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون آپ کی صحت گذشتہ کئی ماہ سے بہتر نہیں تھی ۔ ۲۶ مئی کو آپ جوڑوں کے درد کے علاج کے لئے نیویارک گئے تھے جہاں ڈاکٹروں نے تشخیص کی کہ آپ معدہ کے السر کے عارضہ میں بھی مبتلا ہیں اسی ماہ ستمبر نیویارک کے ایک ہسپتال میں آپ کے معدہ اور آنتوں کے دو آپریشن کئے گئے تھے اور اس کے بعد آپ کی صحت تیزی سے بحال ہو رہی تھی ۱۷ ستمبر کو اچانک قلب کا دورہ پڑا اور آپ مسلسل تین روز تک غشی کے عالم میں رہے، ۲۰ ستمبر کو آپ ہوش میں آ گئے آپ نے اپنے صاحبزادے اور داماد سے گفتگو کی اور ڈاکٹروں نے بتایا کہ آپ خطرے کی زد سے باہر آ گئے اور اب تشویش کی کوئی بات نہیں۔ لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا ۲۲ ستمبر کو آپ کو قلب کا دوسرا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا ۔

مرحوم مولانا مودودی صاحب نہ صرف ایک تحریک کے بانی بلکہ عہد حاضر کے ایک ممتاز عالم، مفسر قرآن اور بیسیوں کتابوں کے کامیاب مصنف بھی تھے، سیاسی محاذ پر آپ کو بھلے ہی کامیابی حاصل نہ ہوئی لیکن عالم دین اور مصنف کی حیثیت سے آپ کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی آپ نے اپنی تحریروں سے کروڑوں دلوں اور دماغوں کو متاثر کیا، ان کے سیاسی افکار اور طرز عمل سے بہتوں کو اختلاف رہا ہو لیکن جہاں تک ان کی علمی و دینی معلومات اور صلاحیتوں کا تعلق ہے اس کے سبھی معترف تھے وہ ایک ایسی شخصیت کے مالک تھے جو صرف برصغیر ہندو پاک ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام میں پہچانی جاتی تھی، اسلام اور مسلمانوں کے متعلق بیسیوں بین الاقوامی کانفرنسوں میں آپ نے شرکت کی اور جس جگہ بھی گئے ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، آپ کی دینی خدمات اور



(۴۴) اور علمی حلقوں کی اعتراف کرتے ہوئے حال ہی میں سعودی عرب کی حکومت نے آپ کو شاہ فیصل ایوارڈ پیش کیا تھا، سچ تو یہ ہے کہ اس ایوارڈ سے مولانا کی عظمت میں نہیں بلکہ خود اس ایوارڈ کی عظمت میں اضافہ ہوا، اس عالم فانی میں جو بھی آیا ہے اسے ایک نہ ایک دن لازمی طور پر جانا ہے، مرحوم مولانا کے بھی دن پورے ہو چکے تھے اور وہ اپنے ان گنت عقیدت مندوں اور قدر دانوں کو سسکتا چھوڑ کر سفر آخرت پر روانہ ہو گئے لیکن ان کی فکر انگیز تحریریں آج بھی موجود ہیں اور ان سے صرف عہد حاضر کے لوگ ہی نہیں بلکہ آنے والی نسلیں بھی استفادہ کریں گی ۔

طارق حسن فلاحی ۔ حیدری ۔ گیا ، بہار

# بھٹکا ہوا مسافر

برادر گرامی ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ برادرم عبید اللہ فہد فلاحی صاحب یہاں تشریف لائے تھے تو میں نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ ماہنامہ حیات نو، چونکہ اسلام پسند طلبہ و نوجوانوں کی امنگوں کا ترجمان ہے، اس لئے اس کی اشاعت میں ان کے فطری ذوق، طبعی رجحانات اور نفسیات کو مد نظر رکھنا ضروری ہے، بطور یاددہانی اور مزید تفصیل کے ساتھ اسی مشورہ کی طرف آپ کے ذہن کو پھر مرکوز کرنا چاہتا ہوں، ماہنامہ حیات نو کی اشاعت کے ذریعہ مسلم طلبہ و نوجوانوں کے درمیان اسلام کو اس طور پر پیش کیا جائے کہ مغربی تہذیب پر فریفتہ اور سرمایہ داری و اشتراکیت کی طرف لپکتا، فریب خوردہ متلاشی صفت نوجوان اسلام کے رخ زیبا اور جمال دل ربا کو دیکھ کر اس کے اندر تازگی و دلکشی محسوس کرے، اس کا اس قدر دلدادہ ہو جائے اور جسے اب تک فرسودہ خیال کرتے ہوئے اس سے بیزار تھا، وہ اسلام اس کی نگاہوں میں اتنا محبوب طریقۂ زندگی بن جائے کہ دنیا کے تمام خود ساختہ ازموں سے متنفر اور ہر جھوٹی ملمع کاری سے مرصع تہذیبوں سے برگشتہ ہو جائے۔

اس مقصد کی تکمیل کے لئے ایک طرف یہ ضروری ہے کہ مضامین کی ترتیب میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ساری تحقیقات دعوتی انداز کی ہوں، اگر کوئی مضمون تاریخی یا تحقیقی ہو تو اس میں بھی دعوتی و فکری رنگ غالب ہو تاکہ عام قاری اس سے محض معلومات کی حد تک مستفید نہ ہو بلکہ اس کے اندر اسلامی بیداری آجائے، اس کے غور و فکر کا زاویہ بدل جائے اور اس کے ذہن و دماغ میں ایک ایسی ہلچل مچ جائے جو اسلام کی خدمت کرنے پر مہمیز کا کام دے۔

دوسری طرف اردو زبان کی چند اہم صنفیں، افسانے، خاکے اور ڈرامے کہ جن صنفوں کے ذریعہ اپنے مافی الضمیر کو موثر انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے اور اس کے ذریعہ معاشرے پر گہرا اثر ڈالا جا سکتا ہے، بسا اوقات وقیع مضامین اور بیش بہا مقالات سے زیادہ زود اثر اور مفید یہ صنفیں ثابت ہوتی ہیں، اور آج جبکہ یہ صنفیں اس قدر عروج پر ہیں کہ ان سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا، پھر آج کا نوجوان ان صنفوں میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے،

لہٰذا نوجوانوں کے میلانات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

آپ کا رسالہ ابھی تک ان مضمونوں سے خالی ہے، آغاز کار کے طور پر میں دو افسانے — "بھٹکا ہوا مسافر" اور "حقدار" ارسال کر رہا ہوں۔ اگر آپ مولانا مودودیؒ نمبر نکالنے والے ہوں تو افسانہ "بھٹکا ہوا مسافر" کو اسی نمبر میں جگہ دینے کی زحمت کریں اور دوسرا افسانہ بعد کی اشاعت کے لئے محفوظ کر لیں، انشاء اللہ جلد ہی ایک دعوتی مضمون بھی بھیجوں گا۔ میری طرف سے تمام اساتذۂ کرام اور رفقاء کو سلام عرض کریں۔ والسلام

خلوص کیش

طارق احسن فلاحی

۲۳ر اکتوبر ۷۹ء

"مجھے معاف کر دیجئے مولانا! خدارا مجھے معاف کر دیجئے۔"

ایک نوجوان مولانا کے قدموں پر جھکا گڑگڑا رہا تھا۔ ۵ ــ اے ذیلدار پارک کی عصری مجلس میں بیٹھے تمام لوگ حیرت و استعجاب کی تصویر بن گئے، سب کی نگاہیں اس نوجوان پر جم گئیں۔

"کیا بات ہے، کچھ کہو تو سہی" مولانا نے نوجوان کے سر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے اخلاص کے پھول برسائے۔

"کر ـ ـ ـ ر ـ ـ ر" نوجوان کے ہاتھ میں چاقو! بیچ کا کھلا چاقو دیکھ کر لوگوں کے اندر بے پناہ خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی، کچھ لوگ اپنی جگہوں سے اٹھ کر نوجوان کی طرف لپکے کہ چالباز نوجوان کے حملے سے مولانا کو بچا سکیں، نوجوان نے لوگوں کے اندیشوں کو بھانپتے ہوئے چاقو بند کر لیا۔

"آپ حضرات خوفزدہ نہ ہوں، میں ابھی تمام راز سے پردہ اٹھائے دیتا ہوں" نوجوان نے کمر میں لگے بیلٹ کے اندر چاقو اڑستے ہوئے لوگوں کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ "میں کالج کا ایک طالب علم ہوں، میں جس آبادی کا باشندہ ہوں، اس میں اکثریت اہل سنت کہلانے والے لوگوں کی ہے، ان کے درمیان رہتے ہوئے مجھے معلوم ہوا کہ مولانا کی دعوتی سرگرمیوں کا مرکز صرف توحید ہے، وہ اپنی کتابوں اور تقریروں کے ذریعہ ایمان کے اسی جز اول کی لوگوں کو دعوت دیتے ہیں اور ایمان کے دوسرے جزو یعنی رسالت پر ان کا ایمان صرف زبان کی حد تک ہے، ورنہ علاوہ وہ توہین رسالت سے بھی باز نہیں آتے۔"

عصری مجلس میں شریک تمام صاحبان نوجوان کی روداد بڑے انہماک اور دلچسپی سے سن رہے تھے، نوجوان اپنی آپ بیتی ایک تسلسل اور روانی کے ساتھ سنائے جا رہا تھا۔

"مولانا کی بابت توہین رسالت کی باتیں سنتے سنتے میرے کان پک گئے، ان کے خلاف نفرت و بیزاری اور غصہ کا کرنٹ برقی رو کی طرح میرے پورے وجود میں دوڑنے لگا، شدت غیض سے میرے اندر جنونی کیفیت پیدا ہو گئی، میں آدھی رات کی تنہائی میں اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا، میں پاگلوں اور دیوانوں کی طرح کافی دیر تک ٹہلتا رہا، میں اپنے غصہ کی آگ بجھانے کے لئے کچھ نہ کچھ کر بیٹھنا چاہتا تھا، مولانا کے خلاف میرے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی اور میں ان سے انتقام لینے کے لئے کسی ٹھوس منصوبہ کا خاکہ بنانا چاہتا تھا، آخر کار میں ٹہلتے ٹہلتے اپنے بستر پر لیٹ گیا، میں سوچ رہا تھا جو شخص سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی جرأت کرے، آپ کی ذات گرامی کی تذلیل میں بیباکی کا مظاہرہ کرے وہ مسلمان کیونکر رہ سکتا ہے، اور پھر ایسے شخص کو خدا کی سرزمین پر جینے کا کیا حق پہنچتا ہے، اس خیال کے آتے ہی ایک فیصلہ کن ارادہ

میرے سارے خانہ ذہن میں جاگزیں ہو گیا اور میری جنونی کیفیت میں اور اضافہ ہو گیا، میں سونے کی ناکام کوشش کرنے لگا، لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی، میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے طلوع سحر کا منتظر تھا اور شب تاریک کا یہ عالم تھا کہ اس کا ایک ایک لمحہ مجھ پر گراں بن کر میری بے قراری میں اضافہ کر رہا تھا، میں نے بڑی بے چینی کے ساتھ وقت کاٹی۔ صبح ہوتے ہی ناشتہ اور دیگر ضروریات سے فارغ ہو کر میں نے بازار کا رخ کیا، ایک دوکان سے بارہ انچ کا چاقو خریدا اور اپنی مہم پر روانہ ہو گیا۔ نوجوان بلا کسی جھجھک کے اپنی داستان سرائی میں محو تھا۔ مولانا سمیت عصری مجلس کے سبھی شرکاء ہمہ تن گوش بنے ہوئے تھے، نوجوان اپنے جذبات کے سیل رواں میں بہا جا رہا تھا۔

دوران سفر میں سوچ رہا تھا جس کا سینہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ کی ذات اقدس کی بے حرمتی کا آشیانہ بنا ہوا ہے، جس کی انگلیاں آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے تقدس پر تنقید کی بوچھار کرتے اور ان میں کیڑے نکالنے کا جواز پیدا کرنے کے لیے صفحۂ قرطاس پر حرکت کرتی ہیں اور ان زہر آلود اور ناپاک تحریروں کے ذریعہ سینکڑوں سادہ لوح انسانوں کو آپ کا باغی بنا کر ضلالت و گمراہی کی خاموش تبلیغ کا فریضہ انجام دیتی ہیں، آج ایسے مکروہ و ملعون شخص کی زبان کاٹ لوں گا ــ اس کی انگلیاں تراش لوں گا ــ اور اس کے سینے میں بارہ انچ کا چاقو اتار کر اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کروں گا ــ میرے اوپر پھر دیوانگی کا بھوت سوار ہو گیا اور میری جنونی کیفیت اس وقت سرد ہوئی جب میرا سفر مکمل ہو گیا، تقریباً ساڑھے چار بجے میں مولانا کی رہائش گاہ پر پہنچا، عصر کی اذان ہو چکی تھی، لوگ نماز عصر کی ادائیگی کے لیے مسجد گئے ہوئے تھے، میں مولانا کے انتظار میں مسجد کے دروازہ کے قریب ٹہلتا رہا اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ کی آواز پر میں چونک پڑا، نماز ختم ہو چکی، لوگ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے، مسجد کے دروازہ سے لگ کر میں مولانا کے انتظار میں جب سادھے کھڑا رہا، لیکن یہ کیا؟ ــ بیٹھے کو وقت نہ لگنے لگی۔ لوگ نماز سے فارغ ہو کر باہر نکلنے کے بجائے مولانا کے حلقہ درس میں بیٹھ گئے۔ سوچ میں پڑا کہ اسی وقت مولانا کے چیلوں اور چہیتے طالبوں کے درمیان اپنے ذوق کی تسکین کا سوانگ رچاؤں لیکن پھر اس خیال سے باز آ گیا کہ خدا کے مقدس دربار کو خون کی ناپاک چھینٹوں سے داغدار کرنا موزوں نہیں اور پھر بڑے ہی صبر و تحمل سے انتظار کی گھڑیاں گننے لگا لیکن اسی لمحہ یہ خیال کروٹیں لینے لگا کہ کیوں نہ مولانا کے ان فاسد خیالات اور باغیانہ رجحانات کو اپنے کانوں سے سن کر اطمینان حاصل کر لوں، جنھیں میں اب تک دوسروں کی زبانی سنتا آیا ہوں، یہ سوچتے ہی میں بھی مولانا کے حلقۂ درس میں چپکے سے شامل ہو گیا، مولانا ایک مختصر حدیث کی تشریح کر رہے تھے:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین۔
(بخاری و مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی مطلوبہ درجہ کا مومن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ میں اس کی نگاہ میں اس کے باپ اس کے بیٹے اور سارے انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

مولانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ الفت و محبت پیدا کرنے کے لیے سامعین کو اکسا رہے تھے، آپ کے اسوۂ مبارک کی مکمل پیروی کرنے کی تلقین فرما رہے تھے اور آپ کی محبت کے تقاضوں کو اتنا دلنشیں انداز میں بیان فرما رہے تھے کہ اس کا ایک ایک لفظ میرے دل و دماغ میں اترتا جا رہا تھا، رفتہ رفتہ میرے اندر سے غلط فہمیوں کی تمام کثافتیں چھٹتی گئیں، رہا سہا شکوک و شبہات کا ایک ایک کانٹا میرے دل سے نکل گیا اور مولانا کی عظمت و نفرت کے بجائے عقیدت و محبت کی ٹھنڈک سے میرا دل مطمئن ہو گیا۔ میں اپنے ارادوں پر نادم و شرمسار ہونے لگا،

اور اسی وقت میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اپنے اس شیطانی ارادے پر مولانا سے معافی کا خواستگار ہوں گا، ان کے سامنے عاجزی و بیکسی کی تصویر بن جاؤں گا، ان کو اپنے سے راضی کرنے کی پوری کوشش کروں گا، یہی وہ جذبہ ہے جس نے ہم کو مولانا کے قدموں پر جھکنے کے لئے مجبور کیا ہے، نوجوان اپنی پوری روداد سنا کر اس طرح خاموش اور مطمئن ہو گیا، جیسے طوفانی موجوں سے ٹکر لے کر تھکا ہوا کوئی جہاز ساحل پر آ لگا ہو اور کسی بھٹکتے ہوئے مسافر کو منزل مل گئی ہو۔

"میں نے تمہیں معاف کیا، خدا تمہاری خطاؤں کو درگذر کرے، راہ راست کی توفیق عطا فرمائے، شیطانی وسوسوں سے محفوظ رکھے اور راہ حق میں استقامت دائمی نصیب فرمائے" مولانا مودودی صاحب کی پر وقار آواز بلند ہوئی اور نوجوان کو جیسے دولت کونین حاصل ہو گئی ہو۔ مولانا نے اسی وقت نوجوان کو اپنی چند کتابیں بطور تحفہ عنایت فرمائیں اور پھر نوجوان خدا حافظ کہتے ہوئے، اشکبار آنکھوں کے ساتھ رخصت ہو گیا، وہ بار بار اور بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا، عصری مجلس کے شرکاء بھی اس کو جاتے ہوئے غور سے دیکھ رہے تھے، رفتہ رفتہ نوجوان لوگوں سے دور ہوتا گیا اور پھر سب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

## ایجنسی کے شرائط

١- ایجنسی ٥ پرچوں سے کم پر نہیں دی جائے گی۔

٢- ٥ سے ٥٠ پرچوں تک ٢٥٪ کمیشن اور اس سے زیادہ منگانے پر ٣٣٪ کمیشن دیا جائے گا۔

٣- ٥ پرچوں کیلئے -/١٠ پیشگی جمع کرنا لازمی ہے۔

٤- ہر ماہ پرچے کمیشن وضع کر کے بل آپ کی خدمت میں روانہ کیا جائے گا، جسے ادا کرنا آپ کا فرض ہوگا۔

٥- ہم اعتماد و تعاون کی فضا قائم کرنا چاہتے ہیں اس لئے وی پی بھیجنے سے ہم قاصر ہیں۔

(منیجر ادارہ)

## پیش رفت اور صرف دیوانوں ہی کا کام ہے

اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم کو مسلمان رہنے یا نہ رہنے کا آخری فیصلہ کرنا ہے، اگر ہم مسلمان رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے ماحول کو اور پھر تمام دنیا کو "دارالاسلام" بنانے کا عزم لے کر اٹھنا ہے اور اگر ہم اتنی جرأت و ہمت نہیں رکھتے تو پھر اسلام سے ہمیشہ کیلئے ہاتھ دھونے پر تیار ہو جانا چاہئے، یہ سوال کہ اسلامی انقلاب لانا ممکن بھی ہے یا نہیں، بعد کا سوال ہے، پہلا سوال یہ ہے کہ تم میں مسلمان بن کر رہنے کا عزم و ارادہ بھی موجود ہے یا نہیں؟ مان لیجئے کہ ناممکن ہے، تسلیم کر لیجئے کہ اس وقت کفر کی طاقتوں کے تابڑ توڑ ہمہ گیر تسلط کو دیکھتے ہوئے جو شخص دارالاسلام کا نقشہ لے کر اٹھتا ہے وہ عقلی دیوانہ ہے اور آگ سے کھیلنا چاہتا ہے، یہ بھی تسلیم کر لیجئے کہ اس وقت بازی قریب قریب ہر چکی ہے اور میدان ہاتھ سے نکل چکا ہے، یہ بھی خوب سمجھ لیجئے کہ اس کا انجام حقیقت میں یہی ہوگا جیسا کہ ہماری قوم کے عقلاء خیال کرتے ہیں کہ زمین و آسمان کا ذرہ ذرہ آپ کا دشمن ہو جائے گا، پھر یہ بھی پیش نظر رہے کہ جہاں کے کفر و نفاق کی طاقتیں تو متحد ہو کر آپ کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں گی مگر مسلمان متحد ہو کر آپ کا ساتھ دینے کے لئے نہیں اٹھیں گے بلکہ آپ کی دیوانگی کا مذاق اڑائیں گے ...... ان سب باتوں کو جان کر اور خوب سمجھ کر اپنے قلب کا جائزہ لیجئے کہ آیا اس میں مسلمان رہنے کا جذبہ اس دیوانگی کی حد تک پہنچا ہوا ہے یا نہیں؟ جن میں یہ دیوانگی موجود ہے، صرف انہیں کی ہم کو ضرورت ہے اور وہی "دارالاسلام" کی تحریک کو چلا سکتے ہیں۔

(مولانا مودودی، ترجمان القرآن)

جناب قمر اصلاحی
(مقیم سرائے میر)

# نذرانۂ عقیدت

## برحلت سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

اسلام کے مفکرِ اعظم سلام ہو
اس دور کے مجددِ اکرم سلام ہو

وہ کارنامہ ہائے عزیمت گواہ ہیں
اے گوہرِ قلم کے متکلم سلام ہو

تبلیغ دین، خدمتِ حق عمر بھر تری
اے رہنمائے دینِ مکرم سلام ہو

تیری وہ فکر دے گئی ہم خستہ حال کو
گنجینۂ معارفِ اعظم سلام ہو

اسلام کے دقیق مسائل کی گتھیاں
چھوڑا نہ ایک بھی کوئی مبہم سلام ہو

یہ قوم بدنصیب تھی، سمجھی نہیں تجھے
پیغامِ حق کے داعیِ اکرم سلام ہو

علمائے سوء سب تھے بنے تیرے مدعی
اسلام کی روایتِ پیہم سلام ہو

تجدیدِ دینِ حق کا تو سرمایۂ بہار
اے حق کے گلستاں کے منتظم سلام ہو

رحلت تری فقط تری تنہا نہیں ہوئی
ملت کا ہے یہ حادثۂ غم سلام ہو

اس کو عطا ہو جنتُ الفردوس اے خدا!
تھا پاسبانِ ملتِ مسلم سلام ہو

دار و رسن بھی سامنے اس کے تھے ہیچ
لاریب! راہِ حق کا تھا محرم، سلام ہو

# دل کی پکار

طفیل محمد
منصورہ، ملتان روڈ
لاہور (پاکستان)

مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر آپ نے جس گہرے رنج اور افسوس کے ساتھ اظہار تعزیت فرمایا ہے اس کے لئے میں اور میرے تمام رفقاء اور مولانا مرحوم کے تمام اہل خاندان تہ دل سے آپ کے ممنون و شکر گزار ہیں۔ ملک کے اندر اور باہر سے جس عالمگیر پیمانے پر نہایت برگزیدہ ہستیوں، رفقاء و احباب اور مولانا مرحوم کے لاتعداد عقیدت مند دل سے ہمارے ساتھ اظہار ہمدردی کیا ہے اس نے ہمارے قلب و دماغ کے بوجھ کو ہلکا کرنے میں بہت مدد دی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ اور ان سب کرم فرماؤں کو اس کے لئے اجر عظیم عطا فرمائے اور مولانا مرحوم کے حق میں ان سب دعاؤں کو شرف قبولیت بخشے اور انہیں اعلیٰ علیین میں مراتب عالیہ سے نوازے۔

خاکسار
طفیل محمد
منصورہ، ملتان روڈ، لاہور
۲۷ر اکتوبر ۱۹۷۹ء

ڈاکٹر اے۔ سے عثمانی
موضع ڈھکلی فرید پور، پوسٹ مریادپور
ضلع اعظم گڑھ۔ یو۔ پی۔

رفیق محترم! السلام علیکم

خط ملا۔ پتہ نہیں کس طرح آپ نے کہہ دیا کہ میں شاعری کرتا ہوں۔ اگر کبھی جذبات کے تحت دو ایک شعر نکل گئے ہوں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ میں جب چاہوں تب شعر لکھ لوں، لہٰذا تعمیل فرمائش سے مجبور ہوں۔

یوں بھی مولانا محترم کی موت کی خبر کا میرے اوپر کوئی خاص اثر نہیں ہوا جیسے ذہن اس خبر کے سننے کے لئے پہلے سے تیار رہا ہو اور اسے میں سانحہ بھی نہیں کہہ سکتا اس لئے کہ ان کی عمر، کسی حد تک عمر طبعی کو پہنچ چکی تھی اور انھوں نے اپنا مشن پورا کر لیا تھا، بلکہ یوں کہئے کہ اللہ تعالیٰ کی تفویض کردہ ذمہ داری بہت حد تک انجام دے دی تھی، مجھے تو اس وقت ایک غم کھائے جا رہا ہے اور وہ غم مولانا مرحوم کی موت کا پیدا کردہ نہیں بلکہ عرصے سے لاحق ہے مولانا کی آواز پر لبیک کہہ کے جو قافلہ چلا تھا، کم سے کم ہندوستان کی حد تک اس کی صورت کافی بدل چکی ہے مجھے وہ زمانے یاد ہیں جب تحریک اسلامی کا ایک رکن عشاء بعد تقریر ختم کر کے ۲۰ میل مسافت کا راستہ یکہ و تنہا پیدل سفر کرتا ہے، تاکہ بروقت ریلوے اسٹیشن

پہنچ جائے اور دوسری جگہ کا پروگرام متاثر نہ ہو۔
سمجھا جاتا ہے کہ راستہ خطرناک ہے اور اکثر وبیشتر وارداتیں ہوتی رہتی ہیں، مگر وہ یہی جواب دیتا ہے کہ اللہ نگہبان ہے۔
مجھے وہ کارکن بھی یاد ہے کہ اس کی بہن کی حالت انتہائی نازک ہے، مگر وہ بہن کو چھوڑ کر اجتماع میں شرکت کرتا ہے اور لوٹنے پر معلوم ہوتا ہے کہ بہن کی تجہیز و تکفین ہو چکی ہے۔
مجھے وہ لوگ بھی نہیں بھولے جو اچھی اچھی نوکریاں چھوڑ کر چلے آئے تھے، نہ ان جیالوں کی یاد محو ہوئی جنھوں نے اپنے شاندار کیریر کی تباہی سے بے پروا، یونیورسٹیاں چھوڑ کر ادنیٰ درس گاہ رام پور میں پڑاؤ ڈالا تھا، ان اجتماعات کی جھلک بھی ذہن کے پردے پر موجود ہے کہ جب ان کی تاریخ مقرر ہو گئی، آندھیاں چلیں، طوفان آئے، پانی برسے، پتھر پڑے مگر اجتماع وقت سے ٹل نہیں سکتا، لوگ آٹھ آٹھ میل پیدل چل کر ضلعی اجتماع میں شرکت کرتے تھے، آج وہی لوگ ہیں، وہی حالات ہیں، مگر قافلے کا رخ بدل چکا ہے، آج ان مجاہدوں اور جیالوں کا دور دور پتہ نہیں جو تحریک پر زندگیاں قربان کر دیں، اجتماعات آج بھی ہوتے ہیں مگر اس انداز میں کہ اس میں شرکت کسی قربانی کا مطالبہ نہ کرے۔ بہت سا ہو تو دیہات میں نہیں آئیں گے۔ اس بات کے لیے تیار انھیں محسوس نہیں کہ اجتماع کی تاریخ مقرر ہو گئی تو ہو گئی، عین وقت تک شبہ لگا رہتا ہے کہ کہیں اجتماع ملتوی نہ ہو گیا، مجلس شوریٰ کی میٹنگ مقرر ہو گئی ہے، اجتماع ملتوی ہو، ذمہ دار کا دورہ ہونے والا ہے، اجتماع ملتوی۔ مولانا مودودی کے جنازے میں شرکت کرنا ہے، اجتماع ملتوی۔ وجوہات بے شمار اور سب کے سب معقول، اس وجہ سے رفقاء کو آخر وقت تک یقین نہ آئے تو تعجب کی بات بھی نہیں، میں ازراہ شکایت نہیں لکھ رہا ہوں، مجھے کچھ ایسا ہی احساس ہو رہا ہے کہ قافلہ کی شکل مسخ ہو چکی ہے۔ ایسا کیوں ہے، میرے ذہن میں ایک شبہ سر اٹھا رہا ہے جس ہستی کی پکار پر یہ قافلہ اٹھا تھا اور اپنا سفر شروع کیا تھا، آج تیس سال سے زائد سے اس کی قیادت سے محروم ہے، اس کی مردم ساز تحریریں آج بھی موجود ہیں، مگر محض ٹیپ ریکارڈ کے طور پر۔ اسٹیج سے دائمی غائب ہو چکا ہے، لہٰذا اس کی موت پر اگر کوئی غم ہے تو صرف یہ کہ پاکستانی قافلہ بھی اپنی منزل کے قریب پہنچ چکا ہے، کہیں اس کی قیادت سے محروم ہو کر بھٹک نہ جائے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس قافلہ کو صحیح سمت لے جائے، رہا مولانا کے لئے دعا تو ہم کیا، ہماری دعا کیا۔ ویسے ایک فریضہ سمجھ کر ان کے لئے دعا کرتے ہیں کہ انھوں نے جو چراغ روشن کیا تھا، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کے لئے تیل بتی فراہم کرنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ وہ کبھی بجھنے نہ پائے۔ آمین۔ رفقاء کرام کو سلام۔

نور العین عثمانی

مکتبہ تحقیقات، رام نگر، بنارس — ۲۳/اکتوبر ۱۹۷۹ء

رفیق مکرم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

گرامی نامہ تو بروقت مل گیا تھا، خیال تھا کہ حیات نو کے پرچے آ جائیں تو خط لکھوں، کل پانچ پرچے ملے، مئی جون کا مشترکہ، اگست ستمبر کا، فروری مارچ کا مشترکہ۔ پرچہ دیکھ کر تعجب آمیز خوشی ہوئی، ہمارا اپنا ترجمان ہو گیا ہے، مجلسی روایات کی حیات نو کا بھی ظہور ہے، ماشاء اللہ، کتابت طباعت سب لائق تحسین، مضامین بھی ہر رنگ کے، مرد خدا بس ایک ایسے اخبار کی بڑی ضرورت تھی جو صاحب ذوق العین کی مزاج پرسی بھی کرتا رہے، حیات نو اس ضرورت کو بھی پورا کرے، بالخصوص اگر [illegible] تعاون اس کو حاصل ہوگا اور میں اس کے لئے اپیل بھی کرتا ہوں۔

امسال ریسرچ کا کام میں نے اس سال کے عشرہ دوم کیا ہی شروع کر دیا تھا، پھر اس کی اشاعت کی کوئی صورت نظر آئی اور ہندی کام بھی بند آ گیا، اس لیے یہ کام رک گیا، اب جب آپ نے سوال اٹھایا ہے تو باوجودیکہ اس کام کے لائق نہیں ہوں، لیکن بتوفیق تعالیٰ کام شروع کر دیا ہے، پہلا مسودہ جتنا بھی لکھا گیا تھا نظر سے گزرا تھا، اب پھر بیٹھ کر مطالعہ دیکھا تو ترمیم و تنسیخ کی ضرورت معلوم ہوئی، اس لئے اسے بھی از سر نو لکھ رہا ہوں، [illegible] انشاء اللہ بہت جلد بھیجوں گا۔

(ابوالعلی امام الدین رام نگری)

# بڑھے چلو! بڑھے چلو!!

## اجلاس شوریٰ منعقدہ یکم اکتوبر کی اجمالی روداد!

چنانچہ قبل ہی تو انجمن کی نیو ڈالی گئی تھی، کسے توقع تھی کہ اتنی جلد جامعۃ الفلاح کے یہ قدیم پروانے اتنا حیرت انگیز کام کر دکھائیں گے۔ طلبہ قدیم کی تنظیم و تحریک، ان کی صلاحیتوں کو اقامت دین کیلئے استعمال کرنے کی دوڑ دھوپ، جامعہ کی عزت و شہرت میں اضافہ کے لئے سعی و جہد اور ایک ماہنامہ آرگن کے ذریعہ ان کی تخلیقی قوتوں کو اجاگر کرنے کا مشکل کام ——— یہ سب کچھ محض اللہ کے فضل و کرم اور دوستوں اور سب انجمنوں کے تعاون سے تاریخ میں پچھلی سرگرمیوں کا جائزہ لینے اور آئندہ کا مکمل پروگرام بنانے کیلئے ہی مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوا تھا جس میں مندرجہ ذیل ارکان شوریٰ نے اپنی اسکیموں اور منصوبوں کے ساتھ شرکت کی:-

١۔ ابوالکلام فلاحی مدنی (صدر)
٢۔ انصار احمد فلاحی (سکریٹری)
٣۔ محمد عمران فلاحی (خازن)
٤۔ ڈاکٹر ابرار احمد فلاحی
٥۔ شہود عالم فلاحی
٦۔ شفیق عالم فلاحی (نائب ناظم)
٧۔ نور محمد فلاحی
٨۔ عبد الحلیم فلاحی
٩۔ نسیم احمد غازی فلاحی
١٠۔ رضوان احمد فلاحی

شجاعت احمد فلاحی اور الیاس احمد فلاحی نامعلوم وجوہ کی بنا پر شریک نہ ہو سکے، اطہر ریحان فلاحی اپنی تعلیمی مصروفیات اور مشرف حسین فلاحی اپنی والدہ کی اچانک علالت کی وجہ سے شریک اجلاس نہ ہو سکے۔

صدر انجمن کے تذکیری کلمات کے بعد کاروائی شروع ہوئی۔ سکریٹری نے اس کے بعد گذشتہ اجلاس کی مفصل کاروائی کی روداد پڑھ کر سنائی اور سالانہ رپورٹ بھی پیش کی، جس پر تمام ارکان نے گوشوارہ آمد و صرف کی روشنی میں غور کیا، پھر ایجنڈا کے تمام شقوں پر بحث و تمحیص کے بعد طے ہوا کہ

فروری ۸۴ء کے آخر یا مارچ کے شروع میں سالانہ اجلاس منعقد کیا جائے اور اس سلسلہ میں اعلانات اور مشوروں کا ابھی سے آغاز کر دیا جائے، حیات نو کا سالانہ زر تعاون پندرہ روپئے اور ممبری فیس سالانہ دس روپئے ہے جن فلاحی حضرات نے ابھی تک ممبری فیس نہ دی ہو، ان سے خط و کتابت کی جائے اور وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے، معقول وجہ کی صورت میں انھیں اعزازی ممبر بھی بنایا جا سکتا ہے۔

حیات نو کی مجلس ادارت سے برادر عبد الحق فلاحی اور برادر عبد اللہ فلاحی کو سبکدوش کر دیا گیا اور نئی ادارتی کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں ان حضرات کی جگہ برادر نسیم احمد غازی فلاحی اور رضوان احمد فلاحی کو ادارت کی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ خدا سے دعا ہے کہ ان کو اپنی ذمہ داریاں کما حقہ ادا کرنے کی توفیق دے۔

طے کیا گیا ہے کہ انجمن کے ممبران کے پتے وقتاً فوقتاً رسالے میں شائع ہوتے رہیں تاکہ خط و کتابت میں لوگوں کو آسانی ہو، اتفاق رائے سے طے کیا گیا کہ انجمن کی ایک مستقل لائبریری قائم کی جائے گی، اس کے لئے ایک مستقل فنڈ قائم کیا جائے گا اور اس کی فراہمی کی ہر ممکن کوشش کی جائیگی۔

مولانا محمد ذکیؒ، مولانا اسحاق جلیس ندوی، محترم محمود الحسینیؒ، مولانا عبد السلام قدوائیؒ کے انتقال پر ملال پر تعزیتی قرارداد منظور کی گئی، اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کی مغفرت فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

گذشتہ سال کی آمد و صرف کا گوشوارہ سنایا گیا جس میں جون ۸۳ء تک